www.naushahidynasty.com

حضرت نوشہ گنج بخشؒ کے کلام میں مرشد کا تصور

نوشہ صاحبؒ کی شاعری میں تصوف کے حوالے سے جن مضامین پر زیادہ زور دیا گیا ہے، ان میں مرشد کا تصور خاص اہمیت کا حامل ہے۔ عام طور پر مرشد سے مراد، راہبر، راہنما، گورو، استاد، معلّم یا وہ ہستی ہے جو ایک سالک کو سلوک کی منزلیں پار کراتی ہے اور حقیقت سے آشنا کرتی ہے۔ اس لیے صوفیائے کرام نے ہر دور میں مرشد کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا ہے اور اس حقیقت کو واضح الفاظ میں تسلیم کیا ہے کہ مرشد کے بغیر دین اور دنیا میں کامیابی کا حصول ناممکن ہے۔ چنانچہ دیگر صوفی شعراء کی طرح حضرت نوشہ گنج بخشؒ نے بھی اپنی شاعری میں مرشد کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کیا ہے اور مرشد کی پہچان بتائی ہے۔ نیز مرید کی شناخت اور اس کے فرائض نہایت وضاحت سے بیان کئے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تصوف میں بالعموم اور پنجابی شاعری میں بالخصوص مرشد کا تصور کیسے پیدا ہوا؟ کیونکہ بعض غیر مسلم مفکرین نے اسے ہندومت کا اثر قرار دیا ہے۔ مثلاً پروفیسر موہن سنگھ کہتے ہیں کہ ''صوفیاء میں مرشد یا گورو پر زور دینا ہندو مذہب کے اثر کا نتیجہ ہے۔''[1]

ہمارے نزدیک پروفیسر موہن سنگھ کا یہ بیان صرف تنگ نظری اور مذہبی تعصب پر مبنی ہے کیونکہ ان کے بیان کو تب ہی درست تسلیم کیا جا سکتا ہے جب کہ مسلم صوفیاء میں مرشد کا رواج برصغیر پاک و ہند میں آمد کے بعد ہوا ہو۔ مسلمانوں میں مرشد کی بیعت کرنے کا رواج اسلام کے ابتدائی دور سے موجود ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک سب سے پہلے مرشد اور راہبر حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کی پاک ذات ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف ڈاکٹر لاجونتی رام کرشنا جیسی متعصب ہندو سکالر نے بھی کیا ہے:

1- ماہنامہ پنجابی ادب، شاہ حسین نمبر ص 18

''تصوف بنیادی طور تے اسلام دے بیج توں پھٹیا سی تے سارے
صوفی پیغمبرِ اسلام محمد ﷺ نوں اپنا آئیڈیل من دے سن تے قرآن
دیاں تمثیلی آیتاں نوں اپنے فکر دی جڑ دسدے سن۔''(1)

یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ مرشد کی بیعت کا حکم قرآن حکیم، حدیث نبویؐ اور بزرگان دین کی تعلیمات کے مطابق ہے یا منافی؟ چنانچہ اس کے لیے ہم سب سے پہلے قرآن حکیم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔قرآن مجید کا ارشاد ہے:

یَـا اَیُّھَـا الَّـذِیْـنَ آمَـنُـوْا اتَّـقُـو اللّـہ وَابْتَغُوا اِلَیْـہِ الْوَسِیْلَۃَ
وَجَاھِدُوْا فِیْ سَبِیْلِہٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْن۔(2)

''یعنی اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو۔اسکی راہ میں وسیلہ تلاش کرو
اور اس کی راہ میں جہاد کرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔''

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ یہاں وسیلہ سے مراد ایمان نہیں۔کیونکہ ایمان والو کو تو مخاطب کیا جا رہا ہے۔ یہاں وسیلہ سے مراد نیک عمل مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج بھی نہیں کیونکہ یہ بدنی عبادات میں شامل ہیں اور تقویٰ کا حصہ ہیں۔اسی طرح یہاں جہاد سے مراد لڑائی نہیں بلکہ تقویٰ ہے۔ یہاں وسیلہ سے مراد ارادت اور بیعت مرشد ہے۔(3)

شاہ اسماعیل دہلویؒ نے بھی وسیلہ سے مراد مرشد ہی لیا ہے اور فرماتے ہیں کہ وسیلہ سے مراد وہ شخص ہے جو اپنی بزرگی کے باعث قرب الٰہی رکھتا ہے۔''مراد از وسیلہ شخصے است کہ اقرب الی اللہ باشد''(4)

1- پنجابی دے صوفی شاعر ص 2 , 6
2- القرآن پارہ 6 سورۃ مائدہ آیت 35
3- شاہ ولی اللہ محدث دہلوی: قول الجمیل؛ اقبال اکیڈمی لاہور 1946ء ص 21
4- اسماعیل دہلوی: منصب امامت؛ مخزن ادب لاہور 1966ء ص 75

قرآن پاک کا ارشاد

قرآن پاک سے کئی ایک شہادتیں ملتی ہیں کہ صحابہ اکرام نے حضور اکرم ﷺ کی بیعت کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے اس نیک عمل کو بے حد پسند فرمایا اور ارشاد کیا کہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی بیعت کرتے ہیں وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی ہی بیعت کرتے ہیں:

" اِنَ الَّذِیْنَ یُبَایِعُونَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُونَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوقَ
اَیْدِیْھِمْ فَمَنْ نَکَثَ فَاِنَّمَا یَنْکُثُ عَلٰی نَفْسِہٖ وَمَنْ اوفٰی بِمَا
عَاھَدَ عَلَیْہُ اللّٰہُ فَسَیُؤتِیْہِ اَجْراً عَظِیْماًo [1]

یعنی اے محبوب! جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں، وہ آپکی نہیں بلکہ اللہ کی بیعت کرتے ہیں (آپ کا ہاتھ نہیں بلکہ) اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہوتا ہے۔ جو شخص اس عہد کو توڑے گا اس کا وبال اسکی جان پر ہوگا۔ جو اپنے رب کے ساتھ کئے ہوئے وعدے کو پورا کرے گا۔ رب اسے جلد ہی بڑا اجر دے گا۔

ایک اور جگہ ارشاد ربانی ہے۔

" یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّھِمُ الْوَسِیْلَۃَ اَیُّھُمْ اَقْرَبُ" [2]

یعنی وہ اپنے رب کی طرف وسیلہ تلاش کرتے ہیں ان میں سے کون اللہ کے نزدیک ہے۔

قرآن پاک کے ان احکامات سے واضح ہو جاتا ہے کہ وسیلہ سے کیا مقصود ہے اور وسیلے کی بیعت کس قدر ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے کس قدر پسند فرمایا ہے۔ چنانچہ بزرگان دین نے وسیلہ سے مرشد کی ذات مراد لی ہے۔ اسماعیل دہلوی فرماتے ہیں:

"باید فہمید بیانش آنکہ مرشد بلا ریب وسیلہ راہ خدا تعالیٰ است" [3]

1- القرآن پارہ 26 سورۃ فتح آیت 10
2- القرآن پارہ 15 سورۃ بنی اسرائیل آیت 57
3- اسماعیل دہلوی: صراط مستقیم؛ ہدایت اللہ اینڈ سنز کلکتہ۔ 1238ھ ص 50

حدیث شریف میں سے مرشد کا جواز

قرآن پاک کے احکامات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرشد کا وسیلہ ضروری ہے، جس کی بیعت کر کے سالک قربِ الٰہی حاصل کر سکے۔ ہمارے نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ قرآن حکیم کی عملی تفسیر ہے۔لہٰذا قرآن پاک کے ان احکامات کی روشنی میں حضور اکرم ﷺ کے عمل کو دیکھنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ احادیث کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں بہت سے مسلمان مرد و خواتین سے بیعت لی اور انہوں نے آپ ﷺ کو اپنا مرشد، ہادی، راہبر اور راہنما تسلیم کر کے آپؐ کے احکامات و نصائح کو اپنی زندگیوں کے لیے مشعلِ راہ بنایا۔

بخاری شریف میں حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ ایک دن وہ آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے تھے۔تو آپؐ نے فرمایا:

بَایِعُونِی عَلٰی اَن لاتُشْرِکُوا بااللہِ شَیْأً وَّلَا تُشْرِکُوْا وَلَا تَزَانُوا وَلَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَکُمْ وَلَا تَاتُو بُھْتَانٍ تَفْتَرُونَہٗ بَیْنَ اَیْدِیْکُمْ وَاَرجُلِکُم وَلَا تَعْصُوْنِی مَعْرُوْفٍo

ترجمہ: تم اس بات پر میری بیعت کرو کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہیں ٹھہرانا۔ چوری، زنا اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کرنا اور نہ ہی کسی پر بہتان تراشی کرنا۔ اچھی بات پر خدا اور اسکے رسول ﷺ کی نافرمانی نہ کرنا۔

بخاری شریف میں ہی عبادہ بن صامتؓ سے ایک اور روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے صحابہ اکرامؓ کو بلایا اور ان سے بیعت لی۔جس کے الفاظ یہ تھے۔

"اَن بَّایَعَنَا عَلٰی السَّمعِ والطَّاعَۃ فِیْ مَکْرِھِنَا وَعُسْرِنَا وَیُسْرِنَا"

ترجمہ: ہم نے سننے اور فرمانبرداری کے لیے بیعت کی ہے اپنی خوشی، رنج، تنگی اور فراخی میں۔

ابن ماجہ سے روایت ہے کہ جب مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو حضور اکرم ﷺ نے مہاجرین سے بیعت لی کہ وہ کسی سے سوال نہیں کریں گے۔

عَلٰی اَنْ لَّا یَسْـئَلُوا النَّاسَ شَیْئاً فَکَانَ حَالُھُمْ یَسْقَطُ سَوْطُہٗ یَنْزُلُ عَن فَرسِہٖ فِیَاخُذُہٗ وَلَا یَسْئَلُ اَحَداً

ترجمہ: وہ لوگوں سے کسی قسم کا سوال نہ کریں۔ ان لوگوں کا یہ حال تھا کہ اگر کسی کے ہاتھ سے کوڑا گر جاتا تھا تو وہ گھوڑے سے اتر کر خود ہی اٹھاتا تھا۔ کسی سے سوال نہ کرتا تھا۔

اسی طرح حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر تقریباً پندرہ سو مسلمانوں نے حضور اکرم ﷺ سے بیعت کی۔

کَانُوْ خَمْسَ عَشَرَۃ مائَۃ الَّذِیْنَ بایَعُو النّبیَ ﷺ یوْمَ الْحدیبۃ

(بخاری شریف)

اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس نے مرتے دم تک بیعت نہیں کی، وہ جہالت کی موت مرا۔

''مَنْ مَّاتَ وَلَیْسَ فِی عُنُقِہٖ بَیْعَۃٌ مَاتَ مَیِّۃً جَاھِلیۃً'' (مشکوٰۃ شریف)

صحابہؓ کا دور

خلفائے راشدین کے عہد میں وسیلہ اور وسیلہ کی بیعت کا رواج قرآن وسنت کے مطابق جاری وساری رہا۔ جب حضرت عثمان غنیؓ خلافت پر متمکن ہوئے تو امام احمد کی روایت کے مطابق حضرت عبدالرحمٰنؓ نے ان کی بیعت کرتے ہوئے کہا۔

''اُبَا یِعُکَ عَلٰی کِتَابِ اللّٰہِ وسُنَّۃِ رَسُوْلہٖ وَسِیْرَۃِابی بَکْرو عُمَرْ''

یعنی میں کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور طریقہ ابوبکر وعمر کے مطابق آپ کی بیعت کرتا ہوں۔ حضرت امام بخاری کے مطابق بیعت کے یہ الفاظ تھے۔

"اُبَا یِعُکَ عَلٰی کِتَابِ اللّٰه وسُنَّةِ رَسُوْلِهٖ وَالْخَلِیْفَینِ مِن بَعْدِهٖ "

یہاں بیعت سے مراد ہی بیعت تقویٰ ہے۔

بزرگان دین کا بیان

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں:

فَلاَ بُدَّ بِکُلِّ مُرِیْدٍ لِلّٰہِ عَزَّوَجَلَّ مِنْ شَیْخٍ عَلٰی مَابَیَّنَّا[1]

مطلب یہ ہے کہ ہر مرید کے لیے پیر کا ہونا لازمی ہے۔ مرید کیلئے اپنے پیر پر اعتقاد ضروری ہے کہ اس کے مرشد سے بڑھ کر اور کوئی بزرگ نہیں ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے نزدیک بیعت کرنا سنت ہے۔ اِنّ الْبَیْعَة سُــــنَّة.[2] حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی تصنیف عوارف المعارف میں حضرت بایزید بسطامی کا قول نقل ہے۔ " عَـنْ لَـمْ یَکُن لَّهُ اُسْتَاذٌ فَاِمَامَهُ الشَّیْطَان" مطلب ہے کہ جس کا کوئی استاد نہیں ہوتا اس کا امام شیطان ہوتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ فرماتے ہیں، جب کوئی مرید عقیدت سے اپنا ہاتھ مرشد کے ہاتھ میں دیتا ہے تو یہ انقاد مرشد کے واسطے سے اس کے مرشد کیساتھ ہو جاتا ہے۔ علیٰ ھذا القیاس یہ انقاد حضرت علی کرم اللہ وجہٗ سے ہو جاتا ہے۔ یوں یہ بیعت پیغمبر خداؐ تک پہنچ جاتی ہے۔[3] حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کے اس فرمان " کُــونُــو مَـــعَ الـصَّـادِقِیْن، وَاتَّبِعُ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ" سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ بیعت کرنا اور مرشد کی صحبت اختیار کرنا طریقہ سنت نبویؐ ہے۔[4] مولانا رومؒ مرشد کی ضرورت اور

-1 شیخ عبدالقادر جیلانیؒ: غنیۃ الطالبین اردو ترجمہ عبدالعزیز نقشبندی لاہور ص 997

-2 شاہ ولی اللہ: قول الجمیل ص 12

-3 شاہ عبدالعزیز: فتاویٰ عزیزیہ، جلد اول کتاب خانہ رحیمیہ دیوبند س ن، ص 28

-4 حاجی امداد اللہ مہاجر مکی: ضیاء القلوب؛ کتب خانہ عزیزیہ دیوبند س ن، ص 4

اہمیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

پیر را بگزیں کہ بے پیر ایں سفر　　　　ہست بس پُر آفت وخوف وخطر
مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم　　　　تا غلامِ شمس تبریزی نہ شُد

مولانا روم کے مرشد حضرت شمس تبریزیؒ تھے۔ ان کی صحبت سے انہوں نے سلوک کی منزلیں طے کی تھیں اور حقیقت سے آشنا ہوئے تھے۔ شیخ سعدی شیرازیؒ بوستان میں فرماتے ہیں:

تو ہم طفلِ راہے بسعی اے فقیر　　　　برو دامنِ نیک مرداں بگیر

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ جب لاہور تشریف لائے تو اپنے مرشد کے حکم سے حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر حاضری دی، وہاں چلہ کشی کی اور فیوض و برکات حاصل کیں۔ حصول فیض کے اس موقع پر آپ نے حضرت داتا گنج بخشؒ کی شان میں بے ساختہ ایک شعر کہا۔ جس سے نہ صرف داتا صاحبؒ کے روحانی مرتبے کی نشاندہی ہوتی ہے بلکہ یہ شعر ہر آنے والے کو اس ضرورت کا احساس بھی دلاتا ہے کہ منزل پر پہنچنے کے لیے مرشد کا ہونا لازمی ہے:

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را راہنما

حضرت شاہ ابو المعالی (960ھ - 1024ھ) (1) فارسی میں اپنا تخلص غربتی کرتے تھے۔ ڈاکٹر باقر نے ان کے ملفوظات بہشت محفل کے نام سے مرتب کئے ہیں۔ ڈاکٹر ظہورالدین احمد نے اپنی کتاب میں ان کے کچھ فارسی اشعار درج کئے ہیں۔

-1 عبدالحمید لاہوری نے مقام ولادت بھیرہ لکھا ہے۔ (بحوالہ بادشاہ نامہ مطبوعہ کلکتہ جلد 1 حصہ دوم ص 336) سید محمد لطیف نے بھی تاریخ لاہور میں قصبہ بھیرہ لکھا ہے۔ مگر ڈاکٹر ظہورالدین احمد کی تحقیق کے مطابق ولادت بھیرہ کی بجائے شیر گڑھ ہے۔ (پاکستان میں فارسی ادب جلد 2 لاہور 1974ء ص 25)

جوانہوں نے اپنے مرشد (حضرت داؤدؒ) کی شان میں لکھے ہیں:

اے خدائے من مرا انجام کار　　　زندہ و مردہ بعشق پیر دار [1]

ہستم از جام محبت ہمہ دم والہ و مست　　　ایں و آں راچہ شناسم من داؤد پرست

دل افسردہ کی باید بگفتِ ہر کسی گرمی　　　دِل داؤدی باید کہ آہن را دہد نرمی [2]

بخت فقر بنشینم چو حاصل گشتہ مقصودم　　　سلیمانی کنم کز جاں غلامِ شاہِ داؤدم

ان کی ایک اور رباعی دیکھئے:

یا رب نظری زعین مقصودم بخش　　　آزادگی زبود و نابودم بخش

ہر چند نیم درخور ایں دولتِ خاص　　　یک ذرّہ ز عشقِ شیخ داؤدم بخش

پنجابی شاعری میں مرشد کا تصور

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ پنجابی زبان اس اعتبار سے خوش قسمت ہے کہ اسے آغاز میں ہی پیروں فقیروں اور درویشوں کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ جدید تحقیق کے مطابق پنجابی کے پہلے معلوم شاعر (جن کا صوفیانہ کلام شلوک کی صورت میں موجود ہے) حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ ہیں، جو چشتیہ سلسلے کے عظیم بزرگ ہیں۔ آپ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خلیفہ حضرت بختیار کاکیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ آپ نے ساری زندگی اپنے مرشد کی بے حد خدمت کی اور مرشد کے تصور کو اہمیت دی۔

ایک بار حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے خلیفہ حضرت بختیار کاکیؒ کے پاس تشریف لائے۔ انہوں نے اپنے مرید حضرت فرید کو فرمایا کہ یہ تمہارے دادا مرشد ہیں۔ ان کے قدموں میں جھک جاؤ۔ بابا فرید خواجہ معین الدینؒ چشتی کی بجائے حضرت

1- پاکستان میں فارسی ادب، جلد دوم ص 25

2- ایضاً ص 35

بختیار کاکیؒ کے قدموں میں جھک گئے۔ انہوں نے تین مرتبہ حکم دیا۔ بابافرید تینوں مرتبہ اپنے مرشد کے قدموں میں جھکے۔ چوتھی بار حکم ہوا تو بابا فریدؒ نے عرض کی کہ حضور! مجھے آپ کے قدموں کے علاوہ اور کوئی قدم نظر ہی نہیں آتے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بہت خوش ہوئے اور بابا فریدؒ کو اپنے سینے سے چمٹا کر روحانی فیض سے مالا مال کر دیا۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے صوفیاء کرام نے مرشد کی ہستی کو کس قدر اہمیت دی ہے۔ بابا فریدؒ کی شاعری میں مرشد کا تصور اسی قدر شدت سے موجود ہے جس شدت کیساتھ انہوں نے محسوس کیا تھا۔ ان کا ایک شلوک دیکھیئے جس میں انہوں نے دنیا کے جھمیلوں کو خفیہ آتش قرار دیا ہے اور خدا کا شکر ادا کیا ہے کہ مرشد نے ان کو اس آگ سے بچالیا ہے:

کِچھ نہ بجھے ، کِچھ نہ سُجھے دنیا گُجھی بھاءِ
سائیں میرے چنگا کیتا نہیں تے میں بھی وجھاءِ[1]

مرشد اپنی ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے مرید کو دنیاوی لالچ اور فانی لذتوں سے محفوظ رکھتا ہے اور دوزخ کا ایندھن بننے سے بچا لیتا ہے۔ مرشد کی اہمیت کے حوالے سے اس بات کا اظہار بابا فریدؒ نے اپنے کلام میں دلچسپ انداز سے کیا ہے۔ مثلاً:

فریدا بھوم رنگاولی منجھ دسولا باغ
جو جَن پیر نوازے آ تنھاں آنچ نہ لاگ[2]
فریدا گُر بن وڈیائیاں دھن جوبن اس گاہ
خالی چلے دُنی سئیوں ٹبے جیوں مینہ آہ[3]

1- آکھیابابافرید نےص 220
2- ایضاً ص 227
3- ایضاً ص 316

پنجابی کے دوسرے بڑے صوفی شاعر شاہ حسینؒ، حضرت بہلولؒ دریائی کے مرید تھے اور انکی خاص توجہ سے انہوں نے سلوک کی منزلیں طے کیں تھیں۔ ان کی کافیوں میں جہاں تصوف کے دیگر مسائل کا ذکر ہے وہاں مرشد کا تصور بھی موجود ہے:

مائے نی میں کیہنوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال (1)
دھوآں دُھکے میرے مرشد والا جاں پھولاں تاں لال
سولاں مار دوانی کیتی برہوں پیا ساڈے خیال
مائے نی میں کیہنوں آکھاں

شاہ حسینؒ کے مرشد کے تصور کے متعلق ڈاکٹر سرفراز حسین قاضی لکھتے ہیں:

''حضرت بابا فرید توں بعد پہلے وڈے شاعر آپ سن۔ آپ نے سبھ توں پہلے تبدیلی عشق دے تصور وچ ایہہ کیتی کہ مرشد دی اہمیت نوں گھٹ محسوس کیتا تے گھٹ ای محسوس کروایا۔ بابا فرید نے باہرلے تے اندرلے دوہاں علماں وچ پیراں دی پیروی کیتی اے تے اوسے نوں اپنی شاعری دا موضوع بنایا اے تے اپنے آپ نوں مخاطب کرکے تبلیغی انداز وچ شلوک یا شعر لکھے۔ حضرت شاہ حسینؒ نے ایس نظریے وچ بنیادی تبدیلی عشق دی کیتی تے عشق دا اظہار ہندی شاعری دیاں روایتاں کولوں متاثر ہوکے زنانی دے مونہوں کیتا۔ (2)

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ شاہ حسینؒ نے اپنی شاعری میں لفظ مرشد بہت کم استعمال کیا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے مرشد کی اہمیت کو کم محسوس کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مرشد کی اہمیت کو دیگر صوفی شعراء کی طرح ہی

1- کافیاں شاہ حسین ص 63
2- سرفراز حسین قاضی: تصوف تے پنجابی دے صوفی شاعر؛ عزیز بکڈپو لاہور 1973ء ص 206

محسوس کیا ہے، لیکن اس کا اظہار لفظ مرشد کے ذریعہ نہیں کیا۔ ان کا کلام علامتوں سے مزّین ہے۔ اس لیے انہوں نے لفظ مرشد کی جگہ رانجھا، دوست ، ماہی، شوہ ، جوگی ، سجن، میرے صاحبا جیسی علامات استعمال کی ہیں۔ یوں ان کا اسلوب دیگر صوفی شعراء سے مختلف ہے، مگر مرشد کی ضرورت اور اہمیت کی اسی طرح محسوس کیا ہے جس طرح اکثر صوفیاء کرام نے کیا ہے۔[1] مثلاً:

صدقے میں ونجاں اوہناں راہواں توں جن راہاں شوہ آیا ای[2]
بچھی سٹ گھتاں بھرڑاندی ، کتن توں چت چایا ای
دل وچ چنگ اٹھی ہیرے دے رانجھن تخت ہزاریوں دھایا ای
کہے حسین فقیر نمانا مولا نے دوست ملایا ای

اس کافی میں شوہ ، رانجھن اور دوست کے الفاظ خاص طور پر مرشد کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

کلامِ نوشہ گنج بخشؒ میں مرشد کا تصور:

شاہ حسین کے بعد تیسرے عظیم صوفی شاعر حضرت نوشہ گنج بخش ہیں انہوں نے نہ صرف اس صوفیانہ روایت کو نبھایا ہے بلکہ اس میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے بعد آنے والے شعراء نے ان کی تقلید کو قابل فخر جانا۔

حضرت نوشہ گنج بخشؒ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے لفظ مرشد کا کینوس اس قدر وسیع کر دیا کہ ان کے سارے کلام پر اسکی چھاپ گیری نظر آتی ہے۔نوشہ صاحبؒ کے نزدیک مرشد اور مرشد کی ضرورت ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے کسی طور بھی انکار نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس سے اغماز برتا جا سکتا ہے۔ اس لیے انہوں نے اس صداقت

1- اختر جعفری، سید، ڈاکٹر: ویروے؛ عزیز بکڈ پو لاہور 1987ء ص 32
2- کافیاں شاہ حسین ص 68

کے بیان کے لیے شاہ حسینؒ کی طرح رمز اور علامت کا سہارا نہیں لیا۔ ان کے خیال میں کوئی رمز، کنایہ یا علامت ایسی نہیں ہے جو مرشد کے عظیم تصور کو مکمل طور پر پیش کر سکے۔ ان کے خیال میں مرشد کا لفظ بذات خود اس قدر جامع وسیع اور پاکیزہ مفہوم ادا کرتا ہے۔ کہ پڑھنے اور سننے والے کو مرشد کے بارے میں مزید استفسار کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔ نوشہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

مرشد ملے ملے خدا　　لوڑ تھوڑ نہ رہندی کا[1]
جو مرشد دے پیریں پیا　　تس دا دکھ دِلدّر گیا
جو مرشد توں تن من وارے　　تس دے نت بھرے بھنڈارے
جس نوں مرشد تے بھرواسا　　کدی نہ ہووے اوہ نرواسا

حضرت سلطان باہوؒ (1039ھ - 1102ھ) حضرت نوشہ گنج بخشؒ کے ہم عصر شاعر تھے۔ ان کی فارسی کتب اور پنجابی کلام میں مرشد کا ذکر نہایت شدّ و مد سے موجود ہے۔ ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے ان کی فارسی تحریروں کے فکری پہلو کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

'' حضرت سلطان باہوؒ کی تمام تصانیف میں فقر سلوک اور تصوف کی تمام بنیادی باتوں کا ذکر موجود ہے مگر مسلسل نہیں اور نہ ہی ان میں ابواب وفصول کا خیال رکھا گیا ہے۔ عقائد و افکار کی ہر جگہ تکرار ہے۔ اور ہر کتاب میں تقریباً ایک جیسی آیات و احادیث مذکور ہیں۔ لیکن ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ ذکر فکر، مراقبہ، مکاشفہ اور اوراد و وظائف سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بس ایک مرشدِ کامل ایک ہی نظرِ التفات سے طالب مرید کو مجلس مصطفویؐ میں حضوری دے کر اس کے دل کو نور تجلی سے روشن کرتا ہے۔ جو مرشد ایسا نہیں کر سکتا وہ مرشدی کے لائق

1- گنج شریف ص 236

نہیں۔''(1)

ان کے نزدیک مرشد کامل کی تعریف یہ ہے کہ:

''وہ مقام شریعت،طریقت ،حقیقت،معرفت، مقام نور الہدیٰ، مقام فناہ و بقا،تصور حضور اور تصرفِ قبور کو اس طرح واضح کر دیتا ہے کہ طالب کو حیات و ممات ، خوف ورجا اور دوزخ وبہشت بھی یاد نہیں رہتے۔''(2)

حضرت سلطان باہوؒ کی پنجابی شاعری میں مرشد کا ذکر نہایت موثر انداز میں موجود ہے جس سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ نوشہ گنج بخشؒ کے دور تک ہر صوفی نے مرشد کی اہمیت وضرورت کو محسوس کیا تھا۔لیکن حضرت نوشہ گنج بخشؒ نے مرشد کی اہمیت ،ضرورت ،مرشد کی پہچان ،مرشد کے فرائض طالب یعنی مرید کی پہچان اور اسکے فرائض کو نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے۔جس کی مثال کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں ملتی۔

مرشد کی پہچان

نوشہ صاحبؒ نے اپنی شاعری میں مرشد کی ضرورت پر ہی زور نہیں دیا بلکہ قرآن وحدیث کی روشنی میں مرشد کی پہچان بھی بتائی ہے۔تاکہ ایک سالک کو مرشد کی تلاش میں سرگرداں نہ ہونا پڑے اور قرآن وحدیث کی روشنی میں مرشد کی تلاش آسان ہو جائے۔نوشہ صاحبؒ کے خیال میں سچا اور کامل مرشد وہ ہے جو عالم ہو اور علم کے ساتھ اس پر عمل بھی کرتا ہو۔یعنی عالم باعمل ہو۔خدا اور رسولﷺ کے احکامات کی تبلیغ اور لوگوں کو ان پر عمل کرنے کی تلقین کرتا ہو۔من گھڑت باتیں دین سے منسوب نہ کرتا

1- پاکستان میں فارسی ادب جلد 2 ص 167

2- ایضاً ص 272

ہو بلکہ شرع محمدیؐ کے مطابق عمل پیرا ہو اور دوسروں کو اسکی تلقین و نصیحت کرتا ہو:

مرشد اوہ جو عالم ہووے نالے ہووے عامل
ایسے مرشد دا جو طالب کیوں نہ ہووے کامل[1]
لِیَبْلغُ الشَاهد منکم و الغائب پاک رسولؐ فرمایا
ابلاغ کرے جو برا خدائی تس مرشد کہنا آیا

مرشد اور شریعت کی پابندی:

سو مرشد جو شرع تے چلے شرع دے راہ چلاوے[2]
بے دیناں دے سنگ نہ رلے اتے ہورناں نہ رلاوے
دسے جو حضرتؐ فرمایا آپ نہ کجھ فرماوے
نوشہ سچا مرشد ملے تے مرشد سچا بناوے

نوشہ صاحبؒ کے خیال میں مرشد کو شریعت، طریقت، حقیقت کا علم ہونا چاہیئے اور یہ علم شرع کی پابندی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ ان کے نزدیک وہ پیر، فقیر یا درویش تقلید کے قابل نہیں جو شریعت کا پابند نہ ہو۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ شریعت اور طریقت دو مختلف راستے ہیں اور حقیقت میں ان کا کوئی جوڑ میل نہیں۔ نوشہ صاحبؒ خود باعمل عالم تھے۔ اس لیے وہ ایسے تصوف کو نہیں مانتے جو شریعت کے خلاف ہو۔ ان کے نزدیک شریعت کے بغیر حقیقت کی راہ تلاش کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ تصوف کی منازل صرف وہی سالک طے کرسکتا ہے جو شریعت کے احکامات پر پوری طرح کار بند ہو۔ اس لیے وہ اپنے خلیفہ پیر محمد سچیارؒ نوشہروی کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

1- گنج شریف ص219
2- ایضاً ص208

آکھے نوشہ قادری توں سُن سچیارا
کیہا منے پیو دا سو پُتر پیارا[1]
حکم شرع دا من لے مرشد فرمایا
سدھے راہے چلیا کیں راہ بھلایا
کم نہ ہووے شرع بن دینی دنیائی
باجھ شریعت منیاں کیہی فقرائی
غیر شرع جو پیر ہے سو پیر نہ کہیے
غیر شرع فقیر تھیں ہک پل نہ بہیئے
ملاں ہووے فقر نہ منے شرع فقیر نہ منّے
نوشہ کہے فقیر قادر دا دونویں حق تھوں بھنّے

حضرت نوشہ گنج بخشؒ فقیری اور فقر کو دو مختلف شعبے تسلیم نہیں کرتے بلکہ وہ فقیر کے پابندِ شرع ہونے پر زور دیتے ہیں۔ ساتھ ہی فقر کے نفاذ کے لیے فقیری کی صفات اپنے اندر پیدا کرنے کی تجویز دیتے ہیں۔ یوں ان کے فکر کی روشنی میں ہمیں فقہ اور فقیری کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ دکھائی دیتا ہے:

فقہ باجھ فقیری ناقص سن پیارے سچیار
باجھ فقیری فقہ معطل نوشہ کہے پکار[2]

جیہڑا قائم شرع تے سوئی مرد فقیر
آکھے نوشہ قادری غیر شرع بے پیر[3]

1- گنج شریف ص 265
2- ایضاً ص 371
3- ایضاً ص 267

مرشد کو شناخت کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اسلیے خاص بندے ہی مرشد کو پہچان پاتے ہیں اوار اس سے فیض حاصل کرتے ہیں۔ ورنہ اکثر صرف تقلیدی مرید بنے رہتے ہیں۔نوشہ صاحبؒ فرماتے ہیں مرد درویش یعنی پیر وہ ہے جو توحید کو اپنا مذہب بنالیتا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے اور نہ ہی کوئی شرک کا کام کرے:

خالص کریں تحقیق سوں عام کریں تقلید
نوشہ خاص درویش ہے مذہب جس توحید (1)

وہی گوروا راوَ ہے جاسوں اُپجے گیان
اگیانی جو گور ملے تاکوں گورو نہ جان (2)

نوشہ صاحبؒ کے خیال میں پیر یا مرشد وہ ہے جس میں اولیانہ اور پیغمبرانہ صفات مجتمع ہوگئی ہوں۔جن کی وجہ سے اس کا باطن روشن ہو اور اپنے سالکین میں باطن کی روشنی تقسیم کرتا ہو۔اس لیے فرماتے ہیں۔

جے تدھ قدرت ویکھنی کر مرشد دا بھیکھ
پیر پیغمبر اولیئے سب مرشد اندر ویکھ (3)

مرشد کا فرض

صوفیائے کرام نے مرشد کی اہمیت اور ضرورت پر زور کسی خاص مقصد کے لیے دیا ہے۔مرشد اپنے مرید کو صراط مستقیم دکھاتا ہے۔ اسے توبہ کا ایسا طریقہ

1- انتخاب گنج شریف ص142
2- ایضاً ص141
3- گنج شریف ص225

بتا تا ہے جس پر عمل کر کے ایک سالک اپنے کیے ہوئے گناہوں سے یوں پاک ہو جاتا ہے جیسے بچہ اپنی ماں کے شکم سے جنم لینے کے بعد معصوم اور پاک ہوتا ہے۔ باالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مرشد اصل میں اپنے مرید کو نیا جنم دیتا ہے۔ اس نئے جنم کے شروع شروع میں ہی وہ اپنے مرید کے دل میں اللہ تعالٰی کی یاد کا ایسا چراغ روشن کر دیتا ہے کہ اس کے بعد کوئی گناہ یا برائی اس کے قریب نہیں پھٹکتی۔ نوشہ صاحبؒ اس سارے عمل کو درخت کے سوکھے پتوں اور تیز ہوا کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

پتر جویں درخت دے ڈھٹھے ہون اک تھاں
وا چلے اڈ جان سب رہے نہ لکھ دا ناں[1]
تویں مرشد دے ڈھٹھیاں رہے نہ ہک گناہ
میں مرشد دے واریا کہے فقیر نوشاہ

O

صحبت مرشد پاک دی کرے گناہ تھیں پاک
آکھے نوشہ قادری میں مرشد دی خاک
مرشد نور خدائے دا کہے فقیر نوشاہ
اندر ہووے چاننا جے مرشد کرے نگاہ[2]

حضرت سلطان باہوؒ حضرت نوشہ صاحبؒ کے ہم عصر تھے۔ انہوں نے بھی اپنے کلام میں مرشد کا ذکر نہایت خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ وہ مرشد کے دیدار کی خواہش کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

1- گنج شریف ص212
2- ایضاً

ایہہ تن میرا چشماں ہووے میں مرشد ویکھ نہ رجھاں ہُو [1]
لوں لوں دے مُڈھ لکھ لکھ چشماں اک کھولاں اک کجّاں ہُو
اتناں ڈٹھیاں صبر نہ آوے ہور کیہدے ول بھجّاں ہُو
مرشد دا دیدار اے باہوؒ مینوں لکھ کروڑاں حجّاں ہُو

اس کے مقابلے میں نوشہ گنج بخشؒ مرشد کے دیدار کے بارے میں زیادہ جذباتی نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک مرشد کا دیدار ہی مرید کی زندگی ہے اگر اُسے مرشد کا دیدار حاصل ہوتا رہے تو زندگی ہے ورنہ موت ہے۔

عشق محبت لایئے سچے مرشد نال[2]
نوشہ عشقوں پایئے دنیا دین کمال
مرشد ڈِٹھے جیوئیے مریئے ان ڈٹھیاں
نوشہ جیون جھوٹھ ہے مرشد وچھڑیاں

o

نت نت ویکھن اکھیاں مرشد در ہر جا[3]
نوشہ مرشد پاک وچ وسے آپ خدا

o

بابا مرشد نال پیار کر سچی حُب کر من[4]
صدق یقین کر ہک تے دُبھتا جیودی بھن

o

1- ابیات سلطان باہو ص 99
2- گنج شریف ص 211
3- ایضاً ص 213
4- ایضاً ص 214

جو آکھے سو من لئے حق دا نائب جان
لانی ہور نہ لاگو مرشد پاک دے ہان
مرشد مرشد آکھدے ساہ گراں سنبھال
آس آسرا ہک رکھ تاہنگ ہور دی ٹال
مرشد دے آستان آ دھوڑ چم متھے لائے
آکھے نوشہ قادری سچا طالب خادم کہلائے

تصوف کی دنیا میں مرکزی نقطہ مرشد کی ذات ہی ہوتی ہے۔ ایک سالک کو شروع سے لے کر آخر تک قدم قدم پر مرشد کی ضرورت رہتی ہے۔ اس لیے صوفیائے کرام نے سب سے زیادہ زور مرشد کے احترام پر دیا ہے۔ چنانچہ ایک سالک کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا سب کچھ مرشد کو ہی سمجھے۔ ہر وقت اسی کے خیال میں مگن رہے اور مرشد کے ادنیٰ اشارے پر اپنا تن من اور دھن قربان کرنے کے لیے تیار رہے۔ یہی اس کا پہلا اور آخری فرض ہے۔ حضرت نوشہ گنج بخشؒ مرشد کے احترام کے متعلق لکھتے ہیں:

منوں مرشد منیئے مُکھوں لیے ناؤں
جے مُنکر منے ناہیں لاہے ناہیں ہاؤں[1]
سرتس تھاؤں واریئے جتھے مرشد رکھے پاؤں
مرشد رستے رتیاں درگہ پائی تھاؤں
نوشہ مرشد منیاں منیئے شہر گراؤں

بن مرشد آن نہ منیئے مرشد دا حُکم نہ بھنیئے[2]

1- گنج شریف ص213
2- ایضاً ص216

مرشد کھٹے طالب کھاوے طلب وڈی وڈیائی [1]
اوکھی ویلے کار چلاوے جو مرشد کرے کمائی
جو مرشد دے آکھے لگے سو مرشد دا بھائی
نوشہ مرشد سچ فرماوے جس سچی گل سنائی

نوشہ صاحبؒ کے کلام پر جگہ جگہ مرشد کا تصور چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے۔

اَطِیْعُو اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُولَ وَ اُوْلِی الْاَمْرِ مِنْکُم.

نوشہ صاحبؒ کے خیال میں "اولی الامر" سے مراد مرشد کی ذات ہے۔ لہٰذا مرشد کی اطاعت قرآن کے احکامات کے عین مطابق ہے۔ نوشہ صاحب فرماتے ہیں:

من فقیرا حکم خدا رسولؐ دا
حکم مرشد دا من ایہہ مُدا مُول دا [2]
اللہ ایہہ فرمایا وچ قرآن دے
نوشہ منّن سے جو اہل ایمان دے
مرشد صاحب امر ہے امر مرشد دا من
آکھے نوشہ قادری دھن مرشد جی دھن
مرشد سچا بادشاہ طالب رعیت خاص
نوشہ مرشد منیاں رہیا نہ خوف ہراس
حاکم مرشد پاک ہے حکم ہوراں دا بھن
آکھے نوشہ قادری جو مرشد کہے سو من

1- گنج شریف ص229
2- ایضاً ص242

سچا نائب رب دا نوشہ مرشد جان
نائب پاک رسولؐ دا مرشد صحیح سنجھان
مرشد سچا پادشاہ طالب رعیت ہوئے
نوشہ مرشد پاک بن ہور نہ جاتا کوئے
مرشد من پیاریا امر مرشد دا من
جے تئیں مرشد منیاں تاں نوشہ آکھے دھن
مرشد منے منیں نوشہ جمل جہان
جیں مرشد نوں منیاں پایا تئیں ایمان
مہر مرشد دی کیمیا پربت کرے رواں
برکت شاہ سلیمانؒ [1] دی نوشہ بھیا نہال

جب سالک اپنے دل و دماغ پر مرشد کا تصور طاری کر لیتا ہے تو پھر اسکی اپنی ذات اور مرشد کے مابین اس قدر گہرا ربط قائم ہو جاتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ بلکہ یوں ہو جاتے ہیں:

صدق کرے سو طالب سچا مہر کرے سو پیر
صدقوں مہروں رب نہ پاویں تاں نوشہ نہیں فقیر [2]

تصوف کے اس درجے پر مرید اگر جسم ہوتا ہے مرشد اسکی روح بن جاتا ہے ظاہر ہے کہ روح کے بغیر جسم بیکار ہوتا ہے۔ جسم کی قدر و قیمت محض روح کے باعث ہے۔ اسی طرح جب مرید اور مرشد ملتے ہیں اور مرید کو جو کچھ نصیب ہوتا ہے وہ مرشد کی محبت اور برکت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اسی لیے نوشہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

1- نوشہ گنج بخشؒ کے مرشد، جن کا مزار بھلوال میں ہے۔
2- گنج شریف ص348

نوشہ مرشد جان ہے طالب دیہہ پران[1]
دیہہ رہے نہیں جان بِن دیہہ بناں رہے جان
طالب دیہہ پران ہے نوشہ مرشد جان
جان بناں کس کام ہے ایہہ دیہی بے جان

نوشہ صاحبؒ کی شاعری میں مرشد کا تصور اس قدر پُر زور اور بھر پور ہے کہ ان کے بعد آنے والے شاعروں نے ان سے اثر قبول کیا اور اپنے کلام میں کسی نہ کسی حوالے سے مرشد کے تصور کو بیان کیا۔ ثبوت کے طور پر نوشہ صاحبؒ کے بعد میں آنے والے چند شعراء کے کلام سے چند اشعار دیکھئے:

سید بلھے شاہؒ

بُلھے شاہ دی سنو حکایت — ہادی پکڑیا ہوئی ہدایت
میرا مرشد شاہ عنایت — اوہ لنگھاوے پار

ماپے چھوڑ لگی لڑ تیرے — شاہ عنایت سائیں میرے
لکیاں دی لج پال وے — ویہڑے آ وڑ میرے[2]

وارث شاہؒ

بادشاہ سچا رب عالماں دا فقر اوس دے ہیں وزیر میاں
بناں مرشداں راہ نہ ہتھ آوے ددھاں باجھ نہ ہوندی ہے کھیر میاں[3]

1- گنج شریف ص 243
2- کلام بلھے شاہ ص 77
3- وارث شاہ: ہیر وارث شاہ مرتبہ عبدالعزیز بار ایٹ لا۔ پنجابی ادبی اکیڈمی لاہور ص 139

میاں محمد بخشؒ

صفت مبارک پیر میرے دی باہر حد بیانوں (1)
پرتوں وی کجھ چکھ شیرینی جاوے پھِک زبانوں
مرد بھلیرا مرشد میرا شاہ غلام محمد
اہل شریعت اہل طریقت وانگ امام محمد
محرم حال حقیقت کولوں واقف ہے عرفانوں
پر تقصیراں نوں تاثیراں ہوون اوس زبانوں
تن من اندر راہ حقانی اندر دین پیغمبر
سالک صوفی نالے زاہد نالے مست قلندر

خواجہ غلام فریدؒ

خواجہ غلام فریدؒ اپنے بڑے بھائی خواجہ غلام فخر الدینؒ کے مرید تھے۔ جن کو فخرِ جہان بھی کہا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں مختلف انداز سے اپنے مرشد کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً:

گھول گھتاں میں فخر جہاں توں جنت حور قصور (2)
چشماں فخر الدین مٹھل دیاں تن من کیتا چور

خاص فرید غلام فخر دا   باندا بردا اس دے دردا (3)
بھٹھ پیا آسرا علم ہنر دا   تکیہ دوست دے دم دا ہے

1- سیف الملوک ؛ محکمہ اوقاف میر پور
2- کلیات خواجہ فرید مرتبہ افضل خان، مکتبہ پنج دریا ٹمپل روڈ لاہور 1974ء ص 52
3- ایضاً ص 192

فخر الدین مٹھل دے شوقوں دم دم نکلے دود
فخر الدین مٹھل دے عشقوں دم دم پیڑ سوائی (1)

وحدت الوجود

دین اسلام کی اساس وحدت کے تصور پر رکھی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں وحدت کے تصور کو راسخ کرنے کے لیے رسالت مآب ﷺ کے عہد کے بعد صوفیائے کرام نے ہر دور میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ زمانی اور مکانی اعتبار سے بلاشبہ ان گنت تبدیلیاں رونما ہوئیں اور نظریات تبدیل ہوئے، لیکن وحدت کے تصور میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کی وجہ اس نظریے کی صداقت اور سچائی ہے۔ اسی صداقت کی بنا پر ہر دور کے صوفیائے کرام نے اپنی تعلیمات کا آغاز وحدت یا توحید سے کیا۔ آج تک کسی نے بھی اس نظریئے سے اختلاف نہیں کیا۔ حضرت شیخ ابوبکر الکلاباذیؒ فرماتے ہیں: (2)

''صوفیاء کا اس بات پر اجماع ہو چکا ہے کہ اللہ واحد ہے، احد ہے، فرد ہے، صمد ہے، قدیم ہے، عالم ہے، قادر ہے، حیٔ ہے، سمیع و بصیر ہے، عزیز و عظیم ہے، جلیل و کبیر ہے، جواد و رؤف ہے، متکبر اور جبار ہے، باقی اور اول ہے، الہٰ اور سیّد (آقا) ہے، مالک اور رب ہے،

1- کلیات خواجہ فرید مرتبہ افضل خان ص 315

2- شیخ ابوبکر ابن ابی اسحٰق۔ وفات 385ھ بخارا کے محلّہ کلاباذ کے رہنے والے تھے۔ تصوف پر ان کی کتاب التعرف مشہور ہے۔ 222 احادیث کی شرح ''بحر الفوائد فی معانی الاخبار'' لکھی۔ جس کے قلمی نسخے لندن، پیرس اور استنبول میں موجود ہیں۔ بقول شیخ شہاب الدین سہروردی وفات 587ھ اگر التعرف نہ ہوتی تو ہم علم تصوف سے واقف نہ ہوتے۔
(بحوالہ۔ یوسف سلیم چشتی: تاریخ تصوف؛ علما اکیڈمی لاہور 1976ء ص 377)

رحمٰن اور رحیم ہے، متکلم ہے مرید اور حلیم ہے، خالق اور رازق ہے۔ اُن تمام صفات سے موصوف ہے جن سے اس نے اپنے آپ کو متصف کیا ہے اور ان تمام اسماء سے مسمیٰ (موسوم) ہے جن سے اس نے اپنے آپ کو موسوم کیا ہے۔ وہ ازل سے اپنی صفات اور اپنے اسماء کے ساتھ موجود رہا ہے اور کسی اعتبار سے بھی اپنی مخلوقات سے مشابہ یا مماثل نہیں ہے۔ اسکی ذات ذوات مخلوقات سے مشابہ نہیں ہے اور اس کی صفات، صفات مخلوقات سے مشابہ نہیں۔ کوئی ایسی بات جو مخلوق پر منطبق ہوسکتی ہے اور جو ان کے حدوث پر دلالت کرتی ہو اس سے منسوب نہیں ہوسکتی۔ وہ ہمیشہ سے مخلوقات پر سابق اور متقدم رہا ہے۔ ہر شے سے قبل موجود رہا ہے۔ اس کے سوا کوئی شے قدیم نہیں اور اس کے سوا کوئی شے الٰہ نہیں ہے۔ (**ولا قدیم غیرہٗ ولا الٰہ سواہ**) وہ نہ جسم ہے اور نہ شبح (شکل) ہے نہ صورت نہ شخص ہے نہ جوہر ہے نہ عرض ہے نہ اس کے لیے اجتماع ہے نہ افتراق ہے، نہ وہ متحرک ہے نہ وہ ساکن ہے، نہ وہ کم ہوتا ہے نہ زیادہ ہوتا ہے۔ نہ اس کے حصص ہیں نہ اجزاء ہیں نہ جوارح ہیں نہ اعضاء ہیں نہ وہ کسی جہت میں ہے اور نہ وہ کسی مکان میں ہے نہ اس پر آفات جاری ہوسکتی ہیں اور نہ اس پر نیند غالب آسکتی ہے، اوقات اسے متداول (منقلب) نہیں کر سکتے (یعنی ابھی فاعل تھا ابھی معطل ہوگیا) اور اشارات اسے متعین نہیں کر سکتے۔ مکان اس پر حاوی نہیں ہوسکتا۔ زمان اسے متاثر نہیں کر سکتا۔ نہ اس کے لیے مماسۃ (چھونا) جائز ہوسکتی ہے اور نہ اس پر عزلۃ (علیحدگی) کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ نہ وہ کسی مکان میں حلول کر سکتا ہے اور نہ مکان اس میں حلول کر سکتا ہے۔ افکار اس کا

احاطہ نہیں کر سکتے اور پردے (حجابات) اسے پوشیدہ نہیں کر سکتے اور آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں۔''[1]

حسین بن منصور حلاج کا ارشاد ہے:

''قبل'' اس (اللہ) سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور ''بعد'' اسے قطع نہیں کر سکتا اور ''من'' تقدیم حاصل کرنے یا آگے بڑھنے کے لیے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ''عن'' اس سے موافقت نہیں کر سکتا۔ ''الی'' اسی سے ملاصق (وابستہ) نہیں ہو سکتا۔ ''فی'' اسے اپنے اندر نہیں لے سکتا۔ ''اذ'' اسے روک نہیں سکتا۔ ''ان'' اس سے مشورہ نہیں کر سکتا۔ ''فوق'' اس پر سایہ انداز نہیں ہو سکتا۔ ''حذا'' (ضد) اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ''عند'' اس سے مزاحم نہیں ہو سکتا۔ ''حلف'' اس کو پکڑ نہیں سکتا۔ ''امام'' اسے محدود نہیں کر سکتا۔ ''قبل'' اسے ظاہر نہیں کر سکتا۔ ''بعد'' اسے فنا نہیں کر سکتا۔ ''کل'' اسے جمع نہیں کر سکتا۔ ''کان'' اسے موجود نہیں کر سکتا۔ ''لیس'' اسے گم نہیں کر سکتا۔ ''خفا'' اسے پوشیدہ نہیں کر سکتا۔ اسکی قدامت زمان (حدوث) پر سابق ہے اور اس کا وجود عدم پر سابق ہے اور اسکی ازلیت غایت (حد) پر سابق ہے۔ اگر تو نے ''متیٰ'' (کب) کہا تو اس کا وجود (کون) وقت پر مقدم ہے اور اگر تو نے قبل کہا تو قبل تو اس کے بعد ہے اور اگر تو نے ھُو کہا تو 'ھا' اور 'واؤ' دونوں اسکی مخلوق ہیں۔ اگر تو نے ''کیف'' کہا اسکی ذات اوصاف سے محجوب ہو جائے گی۔ اور اگر تو نے ''این'' کہا (وہ کہاں ہے) تو اس کا وجود تو مکان پر مقدم ہے اور اگر تو نے ''ماھُو'' کہا (ماہیت دریافت کی) تو اس کی ھویت

1- تاریخ تصوف ص 387

(ذات) تمام اشیاء کائنات سے مبائن (مختلف) ہے۔ اس کے غیر
کو ایک ہی وقت میں دو صفات متضادہ سے متصف نہیں کیا جا سکتا۔
لیکن اسکی ذات میں صفات متضادہ کوئی تضاد یا تخالف پیدا نہیں
کرتیں۔ پس وہ اپنے ظہور میں باطن اور اپنے استتار میں ظاہر ہے۔
وہ ظاہر بھی ہے باطن بھی ہے۔ القریب بھی ہے، البعید بھی ہے اور اس
اعتبار سے مخلوقات سے مشابہت سے وراء الوراء ہے۔''(1)

صوفیا کے ان بیانات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خالق کائنات کو سمجھنا یا اسکی وسعت کو پانا کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن جسے قدرت چاہے اپنی معرفت سے نواز دیتی ہے۔ بقول حضرت غوث الاعظمؒ:

''مگر معرفت وعشق ومحبت صرف خدا ہی کی عنایت سے حاصل ہو
سکتی ہے۔''(2)

لیکن اس حقیقت سے قطعاً اغماز نہیں کیا جا سکتا کہ ساری کائنات میں سے صرف ''حضرت انسان'' ہی اللہ تعالیٰ کا خلیفہ بننے کے قابل سمجھا گیا اور اللہ تعالیٰ نے خود ''اِنّی جائلٌ فِی الاَرُضِ خَلِیُفَہ'' کا فیصلہ کرتے ہوئے انسان کا ہی انتخاب کیا۔ اس لیے اپنے مالک کی معرفت حاصل کرنے کا فرض اس کے خلیفہ پر ہی عائد ہوتا ہے۔ چنانچہ اس اہم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے صوفیائے کرام نے اپنی زندگیاں صرف کر دیں اور آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ انسان کو محض اس لیے خلیفہ بنایا گیا کہ انسان اللہ کا بھید ہے اور اللہ انسان کا بھید ہے بقول حضرت غوث الاعظمؒ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

1- تاریخ تصوف ص 390
2- عبدالقادر جیلانی شیخ: رسالہ غوث الاعظم، اردو ترجمہ مولوی احمد حسین خان، لاہور 1978ء ص 51

"الانسـان سِـرّی وانـا سرّہٗ لو علم الانسان منزلۃ عندی
لـقـال فـی کـل نـفــس مـن الانفاس لمن الملک الیوم
الالی". (1)

ترجمہ: انسان میرا بھید ہے اور میں انسان کا بھید ہوں۔ اگرانسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا مرتبہ میرے نزدیک کیا ہے تو ہر سانس کیساتھ کہے گا کہ ساری بادشاہت سوائے میرے کسی اورکو زیب نہیں دیتی۔

چنانچہ اس ربی بھید کو پانے اورحقیقت تک رسائی کے لیےصوفیائے کاملین نے بے حد کٹھن اور دشوار منازل طے کی ہیں۔عام طور پر ایک سالک کوحقیقت کی منزل تک پہنچنے کے لیے فنافی المرشد، فنافی الرسول اور فنافی اللہ کی منازل طے کرنا پڑتی ہیں۔ پھر وہ بقا باللہ کی ابدی منزل تک پہنچ پاتا ہے۔صوفیاء کےنزدیک ایک سالک کی پہلی منزل فنافی المرشد ہوتی ہے اس منزل پر سالک اپنے وجود وہستی کو بھول کر مرشد کی ہستی کےنقش کولوح قلب پرمحفوظ کر لیتا ہے۔ اور آنکھوں میں سما لیتا ہے۔ اور اس کے وجودکو نہ صرف اپنے اردگرد بلکہ اپنی ذات کے اندرمحسوس کرتا ہے۔ کیونکہ اسے ہر طرف مرشد ہی مرشد دکھائی دیتا ہے۔ اسکی اپنی کوئی ذات نہیں رہتی۔صرف مرشد کی ذات باقی رہتی ہے۔ اس کے بعد مرشد کی خاص توجہ سے سالک فنافی الرسول کی منزل میں قدم رکھتا ہے۔اس منزل پراسے مرشد کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عبادت، ریاضت اورمجاہدات سے رسول اکرمﷺ کی مقدس محفل میں حاضری نصیب ہوتی ہے۔ اسے ہر طرف شان رسول اللہﷺ کے جلوے دکھائی دیتے ہیں۔ اس مقام پر نہ اسے اپنی ذات ہستی کا ہوش رہتا ہے اور نہ ہی مرشد کی ذات کہیں نظر آتی ہے۔ سالک کے لیے یہ منزل بے حد دشوار ہوتی ہے اور وہ خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔کیونکہ یہ منزل نہایت ہوشمندی کا تقاضا کرتی ہے۔ اگرکوئی سالک اپنی ذات پر

1- رسالہ غوث الاعظم ص 57

نازل ہونے والی رسولی تجلیات کے راز منکشف کر دے تو وہ گمراہ ہوسکتا ہے۔ لہٰذا اس مقام پر ایک کامل مرشد اپنے مرید پر ہر لحظہ نگاہ رکھتا ہے اور قدم قدم پر اسکی راہنمائی کرتا ہے۔ سالک سخت مجاہدہ کے بعد اگلی منزل فنافی اللہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ تصوف میں یہ آخری مشکل منزل کہلاتی ہے۔ اس منزل تک بہت کم صوفیاء پہنچتے ہیں۔ کیونکہ یہاں پہنچ کر سالک کو اپنی ہر مرضی اور ہر ارادہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے چھوڑنا پڑتا ہے۔ وہ اپنی ہستی کو لا الہ کی عملی تفسیر سمجھتا ہے اور خداوند کریم کی ہستی کا الا اللہ کی صورت میں نظارہ کرتا ہے۔ اس پر جب ربی تجلیات وارد ہوتی ہیں تو اسے کائنات کی ہر شے فانی اور رب کی ذات کے باقی ہونے کا عملی مشاہدہ ہو جاتا ہے۔ اسے ہر طرف عَلٰی کُلِّ شَیئٍ قَدِیُر کی صحیح تصویر دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اسے اپنی ذات پر بھی رب ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ سالک کے لیے یہ نہایت ہی ضبط و امتحان کا مقام ہے۔ وہ حیرت سے ہر چیز کو دیکھتا ہے مگر زبان سے کچھ بول نہیں سکتا۔ یہاں وہ مُوُتُوُاقَبل اَنُ تَ مُوُتُوُ کی عملی تصویر بن جاتا ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں:

''اس مقام میں موحد اپنی شخصیت اور ارادے کو بالکل محو کر دیتا ہے۔ پس وہ اس ذرّے کی مانند ہو جاتا ہے، جیسا کہ وہ قبل تخلیق، میثاق توحید کے وقت تھا۔ جب اس نے ''الست بربکم'' کے جواب میں ''بلیٰ'' کہا تھا۔ نیز اس توحید کا مطلب یہ ہے کہ اس مقام میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال کے سامنے سالک کی شخصیت بالکلیہ فنا ہو جاتی ہے۔ اور اس صورت میں وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں بمنزلہ آلہ بن جاتا ہے۔ ایک ایسی شے جس کا ارادہ کچھ نہیں۔ فاعل اس سے جو چاہے کام لے اور اس کا جسم ظاہری دراصل اسرار خداوندی کا خزینہ بن جاتا ہے اور اس کے الفاظ اور افعال خدا ہی سے منسوب

ہوتے ہیں۔"[1]

یہ وہ مقام ہے جہاں سالک کو خداوند کریم کا قرب اور وصال نصیب ہوتا ہے اور وہ اپنی ہر خواہش، چاہت اور رغبت چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع ہو جاتا ہے۔ اسے اپنی مرضی خداوند تعالیٰ کی رضا میں مدغم کرنا پڑتی ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کا فرمان ہے:

"جب دُوری کا احساس مٹ جاتا ہے اور قرب حاصل ہو جاتا ہے تو صوفی پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ میری صفات دراصل خدا ہی کی صفات ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکی صفات فنا ہو جاتی ہیں۔"[2]

حضرت داتا گنج بخشؒ اس کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں:

"حقیقی توحید میں انسانی صفات باقی ہی نہیں رہتیں۔ کیونکہ انسانی صفات قائم بالذات اور مستقل نہیں ہیں محض رسوم ہیں، سراسر غیر مستقل اور عارضی۔ جیسے آئینے میں عکس، فاعل حقیقی صرف خدا ہے۔ اس لیے وہ دراصل صفاتِ باری ہیں۔"[3]

پیران پیر حضرت غوث الاعظمؒ فرماتے ہیں کہ بندے میں اس وقت خدائی صفات پیدا ہوتی ہیں جب وہ اپنی تمام اچھی اور بری صفات اور خصائل کو ترک کر دیتا ہے:

"اے دوست جب تو ستر ہزار اچھے اور برے خصائل سے باہر نکل پڑے اور جب اجالے اندھیرے کے ستر خدائی پردوں سے بالاتر

1- کشف المحجوب، اردو ترجمہ ص 28
2- تاریخ تصوف ص 223
3- بحوالہ رسالہ غوث الاعظم ص 10 - 9

ہو جائے اور جب تجھ میں خُلق خداوندی پیدا ہو جائے تو اس کیفیت
میں تجھ سے عبودیت (بندہ پن) دور ہو جائے گا۔تو یکون عیش
کعیش الله، (عیش خداوندی کی طرح) عیش میں سکون پائے گا۔
اس حالت و کیفیت میں تیرا فقر پورا ہو جائے گا.......... بشریت جو
تیرا وجود تھی تیرے اور اس کے درمیان حائل تھی۔ جیسا کہ حکایت
ربانی ہے''وجودک حجاب بینی بینک''(یعنی تیرا وجود ہی
میرے اور تیرے درمیان پردہ ہے) اس وقت تُو تُو نہ ہوگا بلکہ وہ ہوگا
کیونکہ خدا کے ساتھ غیر خدا نہیں رہتا۔''(1)

جب ایک سالک کو یہ مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے تو اسے اس حقیقت کا ادراک ہو جاتا ہے کہ:

''میں اس کا غیر نہیں ہوں کیونکہ فَلایَکُوْنَ مَعَ اللّٰہ غَیر اللّٰہ (اللہ
کے ساتھ غیر اللہ نہیں رہتا) تو یقیناً انا الحق کہنا پڑتا ہے۔ اس جگہ کہنے
والا وہی حق تعالیٰ ہے جیسے کہ درخت سے اِنّی انا اللہ کہلوایا۔ اسی
طرح منصور نے بھی انا الحق کہا۔ بایزید نے بھی اسی طرح
''سبحانی'' کہا۔''(2)

بعد میں جب سالک بقاباللہ کی منزل پر پہنچتا ہے تو اس حقیقت سے آشنا ہو جاتا ہے کہ اللہ کے ساتھ غیر اللہ نہیں رہتا۔ یہی وحدت الوجود کا فلسفہ ہے۔ وحدت الوجود کے اس فلسفے کو ہر دور کے صوفیاء کاملین نے نہ صرف قبول کیا ہے بلکہ اس کے حق میں بھر پور دلائل پیش کر کے اسے صحت مند اور دلکش بنانے کی سعی کی ہے۔ چنانچہ اس

-1 رسالہ غوث الاعظم ص 9,10
-2 ایضاً ص 59

فلسفہ کومحی الدین ابن عربی[1] نے اپنی منفرد فکر کے رنگ میں رنگ کرقرآن وحدیث کی روشنی میں نہایت جاذب انداز میں پیش کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ فارس اور پاکستان و ہند کے مسلمان صوفیاء نے اس فلسفے کو بہت جلد اپنی سوچ کا حصہ بنا لیا۔فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم ابن عربی کی مشہور تصانیف ہیں۔ انہوں نے فصوص الحکم میں مسئلہ وحدت الوجود کوموثر انداز میں پیش کیا ہےاور اسکی بنیادقرآن اور حدیث پر رکھی ہے:

> ''شیخ محی الدین نے وحدۃ الوجودی تصوف کو باقاعدہ قرآن وحدیث کے حوالوں سے اسلام کا مسلّمہ عقیدہ ثابت کیا۔ اور اپنی کتاب فصوص الحکم میں ذاتِ منزہ حق تعالیٰ کا مرتبۂ احدیت سے مرتبہ انسان تک تنزلات کا بیان نہایت جامعیت اورتفصیل سے کیا ہے۔''[2]

شیخ محی الدین ابنِ عربی کے نزدیک توحید کے معنی ہیں کہ خداوند تعالیٰ کے سوا اور کوئی چیز عالم وجود میں موجودنہیں یا اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ موجودصرف خدا ہے۔ اسے ہمہ اوست بھی کہتے ہیں۔ ساری دنیا اس ہستی مطلق کی مختلف صورتیں اور اشکال ہیں۔ جوتعدد محسوس ہوتا ہے وہ اعتباری ہے۔ وہ ایک ہی ذات ہے، جو ہراسم کی مسمیٰ ہر مظہر کی اصل اور ہر مقرر کی حقیقت ہے۔ جہان میں کوئی غیرنہیں۔ ہر جگہ اسی کا ظہور ہے۔ ہر وجود میں وہ ذہنی ہے یا خارجی، خدا کا وجود ظاہر ہے۔ کیونکہ اصل وجودتو

-1 مکمل نام محمد بن علی بن محمد الحاتمی الطائی ولادت 560ھ اندلس کے شہر اڑیسہ میں ہوئی۔ 590ھ میں مشرق کا سفر کیا۔ دمشق، بیت المقدس مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ سے واپس اڑیسہ آئے۔ 598ھ میں دوبارہ اشبیلیہ سے مکہ، بغداد، موصل حلب اورقونیہ گئے۔ 601ھ بغداد اورموصل کے علماء سے حدیث کا علم سیکھا۔ 608ھ میں واپس بغداد آئے۔ 620ھ میں دمشق میں سکونت اختیار کی۔فصوص الحکم 617ھ اورفتوحات مکیہ 636ھ میں لکھیں جوتصوّف میں اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔

-2 حسن علی ملک: (مرتب) تعلیمات مجددیہ؛شرقپورشریف 1965ء ص 177

اسی ہستی کا ہے۔ باقی سب کچھ دکھاوا ہے کائنات کی تمام تر رونقیں اس ذات کے حسن کے لشکارے ہیں۔ دنیا میں اگر کوئی دانا اور بینا ہے تو وہی ہے یا اسکی ذات کا عکس اور تجلی ہے۔ دنیا میں جس قدر کمالات اور اوصاف سمجھے جاتے ہیں سب اسی کے مظہر ہیں۔ اس کُل نے جزئیات میں اپنا ظہور کیا ہے۔ حقیقت سے مجاز، ذات سے صفات، صفات سے افعال، کمال سے نقصان، نقصان سے کمال، مسمیٰ سے اسم، روح سے جسم، بلندی سے پستی، اور پستی سے ہستی۔ یہ سب کچھ اسی وجود مطلق کی نمائش ہے۔

ابن عربی کے نزدیک "نَحنُ اَقرَبُ اِلَیہِ مِنْ حَبلِ الْوَرِیْد" (ہم انسان کی شہ رگ سے قریب تر ہیں) کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا خود بندے کے وجود کا حصہ بن سکتا ہے۔ ابن عربی کے نزدیک خَلق اللّٰہ آدَم عَلٰی صُوْرَتِہٖ، والی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا اور اپنی تمام صفات اس میں پیدا کر دیں۔ لہذا انسانی صفات دراصل ربی صفات ہیں جن میں انسان کا ظہور ہوا ہے۔ یعنی صفات مجسم ہو کر انسان میں موجود ہیں۔ اسی لیے اکثر صوفیاء مَنْ عَرَفَ نَفْسهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّــه (جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔) پر یقین رکھتے ہیں۔ اسے مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ خودی کی معرفت دراصل خدا کی معرفت ہے۔ خداوند کریم کا کس طرح کائنات میں ظہور ہوا۔ اس کے متعلق ابن عربی اس روایت کو دلیل بناتے ہیں۔ کُنتُ کَنْزًا مَخْفِیًا فَاَحبَبْتُ اَن اُعْرَفُ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِاُعْرَفَ '' (یعنی میں پردہ تنزیہہ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ مجھے شوق ہوا کہ میں پہنچانا جاؤں تو میں نے خلقت کو پیدا کیا تا کہ اس عالم امکان میں اپنے آپ کو ظاہر کروں)

ابن عربی کے خیال میں ذات باری تعالیٰ جب تک مرتبہ احدیت میں ہے وہ ذات منزہ ہے اور اسی میں اس کو تنزیہی شان حاصل ہے۔ لیکن جب وہ ذات تجلی کے ذریعے اپنا ظہور فرماتی ہے تو اس وقت وہ تشبیہی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ کیونکہ

صورت یا تعین کے بغیر ظہور ممکن نہیں۔ لہذا اللہ تعالیٰ کی ذات تنزیہی اور تشبیہی دونوں صفات کی مالک ہے۔ پنجابی کے تقریباً تمام شعراء ابنِ عربی کے اس فلسفے کے حامی دکھائی دیتے ہیں۔ مولوی غلام رسول عالمپوری فرماتے ہیں۔

کُل مراتب حقی خلقی تنزیہی تشبیہی
مظہر حمد حمید حقیقی ایہہ مکشوف بدیہی (1)

عہد جہانگیری تک عرب وعجم کے اکثر صوفیاء ابن عربی کے اس نظریہ وحدت الوجود کے قائل رہے لیکن جہانگیری عہد میں حضرت مجدد الف ثانی ؒ نے پہلی مرتبہ اس نظریئے کے مقابل وحدۃ الشہود کا نظریہ پیش کیا۔ قبل ازیں حضرت مجددؒ اور ان کے مرشد خواجہ باقی باللہؒ کا مسلک بھی وحدۃ الوجود ہی تھا:

''حضرت خواجہ باقی باللہ کا مسلک شروع میں وحدت الوجود کے قریب تھا۔ اورگلزار ابرار میں لکھا ہے کہ ان کے جانشین مرزا حسام الدین احمد نے اسے جاری رکھا۔ (2)

وحدۃ الشہود کے فلسفے کے مطابق مخلوق اپنے خالق سے جدا ہے۔ عالم امکان میں جو کچھ بھی موجود ہے۔ اس کا علیحدہ وجود ہے۔ جس کا ازلی ہستی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی اس کا عکس ہے۔ ذات باری تعالیٰ نہ تو کائنات کی کسی شے میں حلول کرسکتی ہے اور نہ ہی کوئی شے اسکی ذات واحد میں فنا ہوسکتی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں:

''صانع راجل شانہٗ باعلم ایں نسبت ہائے مذکور ہیچ ثابت نیست۔ احاطہ قرب اوتعالیٰ علمی است۔ چنانچہ مقرر اہل حق است، شکر اللہ سَعْیُہُم و اوسبحانہٗ، باہیچ چیز متحد نیست او است تعالیٰ و تقدس و عالم عالم، او

1- مولوی غلام رسول عالم پوری: احسن القصص لاہورس ن۔ص 2
2- شیخ محمد اکرام: رود کوثر لاہور 1958ء ص 261

سبحانہٗ، بیچون و چگونہ است و عالم سراسر بداغ چونی و چگونی متسم بیچون
راعین چون نتواں گفت، واجب تعالیٰ راعین ممکن نتواں خواند۔ قدیم
ہرگز عین حوادث نشود۔''[1]

شیخ محی الدین ابن عربی اس عالم کو معدوم اور موہوم سمجھتے ہیں اور نفس الامر میں موجود فی الخارج سے انکار کرتے ہیں۔ حضرت مجددؒ کے خیال میں ابن عربیؒ حقیقت کو سمجھنے اور اس تک رسائی حاصل کرنے میں معذور رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ابن عربیؒ کو تجلیات ربانی کے مقام پر یہ محسوس ہوا کہ وہ ذات احد کو بے نقاب دیکھ رہے ہیں۔ اس مقام پر ان کی توجہ ذات احد پر مرکوز رہی اور ماسوا کے خیال کیساتھ ان کو نسیانِ کلی پیدا ہوگیا۔ کیونکہ یہ ایسا مقام ہے جہاں سالک کو خداوند کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا اور اسے ماسواء کے خیال کے ساتھ نسیان کلی پیدا ہو جاتا ہے۔ مجدد صاحبؒ کے خیال کے مطابق ابن عربیؒ اس مقام پر کھو گئے۔ اگر وہ اس مقام سے ذرا ترقی کر کے اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتے تو ان کو مقام فنا تک پوری اور مکمل رسائی حاصل ہو جاتی۔ ان کو اپنی غلطی کا احساس بھی ہو جاتا ہے اور وہ جان لیتے کہ رب تعالیٰ کی ذات وراء الوراء ہے۔ یعنی وہ ذات ہمارے کشف اور شہود سے بالا تر ہے۔ مجدد صاحبؒ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے مکتوب نمبر 43 میں ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ جیسے ایک شخص سورج کی روشنی میں ستاروں کو نہیں دیکھ سکتا۔ کیونکہ اسے دن کے وقت سورج کے علاوہ آسمان پر اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ آسمان پر ستارے موجود ہیں۔ جو سورج کی روشنی میں دکھائی نہیں دے رہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی ستاروں کی موجودگی سے انکار کرے تو اس کا انکار حقیقت کے خلاف ہوگا۔ اسی طرح جب ایک سالک ہر طرف ربی تجلیات کو دیکھتا ہے۔ تو ان تجلیات کی گہما گہمی میں وہ کائنات کی باقی چیزوں کو بھول جاتا ہے۔ مجدد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ تجلیات ربانی کی گہما گہمی میں کائنات کا نظر نہ آنا

-1 مجدد الف ثانی احمد سرہندی: مکتوبات؛ نولکشور لکھنؤ 1877ء دفتر اول مکتوب 31

اپنی جگہ حقیقت ہے۔لیکن خالق کے علاوہ اپنی ذات اور اسکی مخلوق کا انکار کیسے ممکن ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''شخصے کہ یقینے بوجود آفتاب پیدا کرد۔ استیلائے ایں یقین مستلزم آں نیست کہ ستاراہارا درآں وقت منتفی ومعدوم داند۔اما وقتیکہ آفتاب رادید البتہ ستارا ہا رانمے بیند۔میداند کہ ستارا ہا معدوم نیستند، بلکہ میداند کہ ہستند، اما مستوراند۔ و درشعشعان نورِ آفتاب مغلوبند وایں شخص یا جماعہ کہ نفی وجود ستارہ ہا درآں وقت کنند در مقام انکار است، ومیداند کہ آں معرفت غیر واقع است۔پس توحید وجودی کہ نفی ماسوایک ذات است۔ تعالیٰ و تقدس باعقل وشرع در جنگ است۔ بخلاف شہودی کہ در یک دیدن، ہیچ مخالفت نیست۔مثلاً در وقت طلوع آفتاب ستارہ ہارانفی کردن ومعدوم دانستن مخالف واقع است۔ امّا ستارہ ہارا درآں وقت نادیدن، ہیچ مخالفت نیست بلکہ آں ندیدن بواسطہ غلبۂ نورِ آفتاب است وضعف بصر رائی۔اگر بصر رائی بنور ہماں آفتاب مکتحل شود وقوت پیدا کند،ستارہ ہاراازآفتاب جدابیند۔''[1]

مجدد صاحبؒ نے نہایت خوبصورت مثال دے کر اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ سورج کی روشنی میں ستارے دکھائی نہیں دیتے اوران کے وجود سے انکارنہیں کیا جا سکتا۔مگر اس حقیقت سے بھی تو انکارنہیں کیا جا سکتا کہ وہ سورج کے نظام سے علیحدہ نظام نہیں رکھتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ستاروں کی روشنی سورج سے مستعار ہے۔ان کی اپنی کوئی روشنی نہیں ہے۔ بلکہ بےنور ہیں۔ان کی جملہ چمک دمک سورج کی مرہون منت ہے۔اس مثال پراگرغور کریں تو معلوم ہوگا کہ ستاروں میں بھی سورج ہی کسی اور انداز سے روشن ہے۔اسی طرح وحدت الوجود کے

1- مکتوبات، دفتر اول مکتوب 43

فلسفے کے مطابق ہر شئے میں خدا وند تعالیٰ کا نور ظہور ہے۔ اس کے بغیر کسی شے کا کوئی وجود ممکن نہیں۔ جیسا کہ نوشہ صاحبؒ نے فرمایا:

چن نہ چانن وکھرا سورج بخشے نور

تیسے مرشد پاک وچ کردا حق ظہور [1]

پاک مرشد وچ ویکھیا پاک دیدار نوشاہ

اَیْنَمَا تَوَلُّوْا افَثَمَّ وَجْهُ اللّٰه

نیز ابن عربیؒ نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات انسان میں حلول کر جاتی ہے۔ بلکہ ان کا دعویٰ اس کے برعکس ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جبکہ اس کائنات میں ذات صرف ایک ہی ہے اور دوسری کوئی ذات موجود ہی نہیں تو پھر حلول کا جواز بھی ختم ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابن عربیؒ نے وحدت الوجود کا جو فلسفہ پیش کیا ہے اسکی تفہیم ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اس لیے بعض ناسمجھ لوگوں نے اسکی غلط تاویلات پیش کر کے غیر اسلامی نظریات کے لیے اسلامی تصوف میں راہیں استوار کیں۔ چنانچہ خاص طور پر نظریہ وحدت الوجود کا سہارا لے کر غیر اسلامی نظریات کو تصوف میں داخل کیا گیا۔ اکبری عہد میں ان نظریات کو بنیاد بنا کر انسانی مساوات کے بہانے ایک نئے دین کی اساس قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسی لیے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے وحدۃ الشہود کے حوالے سے تصوف کے میدان میں جو جہاد کیا، اسے ہم وحدۃ الوجود کے نظریے کے خلاف نہیں سمجھتے۔ وہ اصل میں ان غیر اسلامی نظریات کے خلاف جہاد تھا جو وحدۃ الوجود کے بہانے اسلامی تصوف میں داخل ہو گئے تھے۔ چنانچہ:

> ''یہ امر قابل ذکر ہے کہ انہوں نے وحدۃ الوجود کی بالکل نفی نہیں کی۔ بلکہ اسے وحدۃ الشہود سے نچلے درجے پر ایک صوفیانہ مقام ظاہر کیا۔ وہ خود وحدۃ الوجود کی منزل میں سرگرداں رہے تھے۔

-2 گنج شریف ص 537

مشہور وحدۃ الوجودی فلسفے شیخ محی الدین کا ذکر بھی انہوں نے اکثر احترام سے کیا ہے۔"[1]

حضرت مجددصاحبؒ کے علاوہ دیگر صوفیائے کرام نے بھی نظریہ وحدۃ الوجود کو جائز اور درست قرار دیا ہے اور اس نظریہ کی مخالفت سے باز رہنے کی تلقین کی ہے۔

حضرت خواجہ خوردؒ ابن باقی باللہ فرماتے ہیں:

"عالم میں حق کے سوا کوئی چیز نہیں۔ عالم بھی وہی ہے اور ظہور بھی وہی ہے۔"[2]

حضرت غوث علی شاہ پانی پتیؒ کے خلیفہ حضرت مولانا گل حسنؒ فرماتے ہیں:

"دیدنِ او ممکن نیست، مگر درصورتِ صاحبِ کمال کہ انسانِ کامل ذاتِ او ذاتِ حق است ومظہر کمالاتِ حق است۔[3]

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں:

"پس کسیکہ قائل تبوحید وجودے باشد۔ اورا کافر گفتن، و از نماز پس پشتِ اُو احتراز کردن و منالحت با اُو نمودن و ذبیحہ اونخوردن ہرگز روانیست بلکہ آنہاں رامسلمان واہلسنت باید دانست"[4]

مولانا اشرف علی تھانویؒ، مسئلہ وحدۃ الوجود کے متعلق لکھتے ہیں:

"مسئلہ حق وصحیح مطابق اللواقع ہے۔ اس مسئلے میں شک و شبہ نہیں۔"[5]

1- رودکوثر ص267

2- ماہنامہ اسرارتصوف، لاہور شمارہ اکتوبر 1924

3- تعلیمات غوثیہ، کراچی س ن ص273

4- شاہ عبدالعزیز: فتاویٰ عزیزی، مجتبائی پریس دہلی س ن، جلد اول ص 52

5- اشرف علی تھانوی: امداد المشتاق؛ مکتبہ اسلامیہ لاہور ص 41

حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ فرماتے ہیں:

''غرض، سالک کو اپنے افعال و صفات اور وجود کو جناب باری کے
صفات، افعال اور وجود سمجھنا چاہیے۔ تمام افعال خدا ہی سے ہونگے۔
اور تمام چیزوں میں خدا کے وجود کو پائے گا۔ سالک، خدا کو اس کے
نور ذات کے ذریعے سے دیکھتا ہے اور اپنے کو درمیان میں نہیں پاتا
اور اسی کو فناہ کہتے ہیں۔''(1)

مطلب یہ ہے کہ ہر طبقے کے صوفیاء اور علماء نے مسئلہ وحدۃ الوجود کو درست تسلیم کیا ہے اور اسے اپنایا بھی ہے۔ صرف سلسلہ نقشبندیہ کے مجددی حضرات وحدۃ الشہود کے قائل ہیں۔ فارسی شعراء میں سے اکثر کا پسندیدہ موضوع وحدت الوجود رہا ہے۔ مولانا رومی، جامی، عراقی کے کلام میں میں اس کی خوبصورت امثلہ ملتی ہیں۔ اسی طرح اردو شاعری میں خواجہ میر درد اور قلی قطب شاہ اور ولی دکنی کے کلام میں وحدۃ الوجود کے متعلق بیشتر اشعار ملتے ہیں۔ جبکہ پنجابی میں تمام کلاسیکی شاعر وحدۃ الوجود کے قائل نظر آتے ہیں۔ پنجابی کے پہلے شاعر حضرت بابا فرید گنج شکرؒ فرماتے ہیں۔

فریدا جنگل کیا بھوئیں ون کنڈا موڑیں
وسی رب ہیالیئے جنگل کیا ڈھونڈیں (2)

فریدا خالق خلق مانہہ خلق وسے رب مانہہ
مندا کس نوں آ کھیئے جاں تس بن کوئی نانہہ (3)

1- امداد اللہ حاجی: ضیاء القلوب؛ کتب خانہ عزیزیہ دیو بند س ن، ص 26
2- آکھیا بابا فرید نے ص 162
3- ایضاً ص 220

شاہ حسینؒ لکھتے ہیں:

اندر توں ہیں باہر توں ہیں روم روم وچ توں[1]
توں ہی تانا ،توں ہی بانا ، سب کچھ میرا توں
کہے حسین فقیر سائیں دا میں ناہیں سب توں

حضرت سلطان باہوؒ کا ارشاد ہے:

ل: احد جد دتی وکھالی از خود ہویا فانی ہو[2]
قرب وصال مقام نہ منزل نہ اوتھے جسم نہ جانی ہو
نہ اوتھے عشق محبت کائی نہ اوتھے کون مکانی ہو
عینوں عین تھیوسے باہوؒ سر وحدت سبحانی ہو

سید بلھے شاہؒ کے اشعار ہیں:

بلھیا چل سنیار دے جتھے گہنے گھڑیئے لاکھ
صورت آپو اپنی توں اکو روپا آکھ

آپے ظاہر آپے باطن آپے لک لک بہندے ہو
آپے ملاں آپے قاضی آپے علم پڑھیندے ہو

آپے آہو آپے چیتا آپے مارن دھایا
آپے صاحب آپے بردا آپے مُل وکایا

کیوں اوہلے بہہ بہہ جھاکی دا
ایہہ پردہ کس توں راکھی دا[3]

1- کافیاں شاہ حسینؒ ص 21
2- ابیات باہوؒ ص 69
3- کلام بلھے شاہؒ ص 62

علی حیدر ملتانیؒ فرماتے ہیں:

ویکھے آپ نوں وکھائے آپ نوں اساں دا ایویں بہانڑا ای
اُتے اپنی صورت مائل جانی آرسی کنوں بیگا نڑا ای
وچہ لیلیٰ دے کرے تماشا اپنا قیس دیوانڑا ای
خم آپ شراب آپے تے آپے آئے میمانڑا ای

سید وارث شاہؒ:

سن سہتیے ایس جہان اتے رب کئی پیار پیار دا ی
قدرت نال خواہش خاص اپنی دے رنگا رنگ دیاں صورتاں دھار دا ای
ع وارث شاہؒ یقین دی گل ایہا سبھا حق ہی حق ٹھہرایئے جی

میاں محمد بخشؒ:

وحدت دا دریا وڈیرا جاں موجاں وچ آوے
ڈھاباں وکھریاں بھن ٹھہناں ہکو لہر بناوے
قطرہ ونج پیا دریائے تاں اوہ کون کہاوے
جس تے اپنا آپ گواوے آپ اوہو ہو جاوے
ہر ہر وچ نہ ہوون جے کر ہردے روپ سہانے
دانشمنداں دا دل ٹھگن کد معشوق ایانے

خواجہ غلام فرید:

سب صورت وچ ذات سبحانی — حق باجھوں بیو غیر نہ جانی
باجھ خدا دے محض خیالے — دل نہ غیریت ہانی
مطلب وحدت ہے ہر حالوں — سک نہ رکھ بئے پاسے تانی
ہر صورت وچ آئم یار — کر کے ناز ادا لکھ وار
ہک جا روپ سنگھار ڈکھاوے — ہک جا عاشق بن بن جاوے

ہر مظہر وچ آپ سماوے   اپنا آپ کرے دیدار

حضرت نوشہ گنج بخشؒ پنجابی کی صوفیانہ شاعری کی روایت کے تیسرے بڑے شاعر ہیں۔ اگر ان کے کلام کی ضخامت اور وسیع پیمانے پر مسئلہ وحدت الوجود کے بیان کو دیکھا جائے تو وہ فلسفہ وحدۃ الوجود کے پہلے عظیم شاعر قرار پاتے ہیں۔ نوشہ صاحبؒ فلسفہ وحدت الوجود کے تحت اس بات کے قائل ہیں کہ کائنات میں کسی چیز کا اپنے طور پر کوئی وجود نہیں۔ جو وجود دکھائی دیتا ہے وہ فانی ہے، عارضی ہے اور ہالک ہے۔ چونکہ فانی کو بقا حاصل نہیں ہے۔ اس لیے فانی کو حقیقت نہیں کہا جا سکتا۔ حقیقت صرف وہی ایک ہی ذات ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ کائنات کی تمام رونقیں اور نظام اسی کا ہے۔ اگر وہ اپنا جلوہ ظاہر نہ کرے تو کائنات اندھیر ہو جائے۔ لہٰذا کائنات کی جان وہ پاک اور منزہ ہستی ہے۔ وہ ہستی ہی مختلف روپ اور اشکال میں ظاہر ہوتی ہے۔ حضرت نوشہ گنج بخشؒ نے ایک خوبصورت مثال کے ذریعہ اسی نکتہ کو واضح کیا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ مکان کی دیواریں نہیں بولتیں بلکہ مکین بولتا ہے۔ جبھی کہا جاتا ہے کہ گھر آباد ہے۔ حالانکہ گھر آباد نہیں ہوتا بلکہ اس میں رہائش رکھنے والا آباد ہوتا ہے۔ اگر گھر میں رہنے والا کوئی نہ ہو تو وہ گھر ویران ہے۔ اینٹوں کا انبار ہے۔ بے جان اور بے آباد ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کا جسم ایک مکان کی مانند ہے۔ اس میں آباد ذات باری تعالیٰ ہے۔ اگر وہ اس جسم میں آباد نہ ہو تو پھر انسان کا جسم اینٹوں کے انبار کی طرح ہے۔ خالی مکان ہے۔ جو گونگا، خاموش اور ویران ہے۔ نوشہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

میں بولاں سو اوہ بولے میرا ایویں پردہ
کندھاں کوٹھے بولن ناہیں بولے واسی گھر دا
میرے اندر سوئی وسے جیں باجھوں میں مردا
نوشہ اس دی اوہو جانے میتھوں کجھ نہ سردا(1)

1- گنج شریف ص369

آپ کے نزدیک ساری کائنات میں صرف ایک ہی ذات آباد ہے:

ہزدہ ہزار(18000) عالم وسے — مرشد سب وچ ہکو وسے [1]

ہر کوئی بولی اپنی بولے — ہر ہر بولی وچ ہر بولے

ہم گذشتہ اوراق میں بیان کر چکے ہیں کہ تصوف میں سالک کی پہلی منزل فنافی المرشد ہوتی ہے۔ جسے وحدت الوجود کا پہلا درس کہا جاتا ہے۔ جب ایک سالک اپنے مرشد کے تصور میں پختہ ہو جاتا ہے۔ پھر اسے اپنی ذات اور مرشد کی ذات میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ نوشہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

مرشد میرا جاگدا میں ستا تاں ہویا کی [2]

اس دا جاگن میرا جاگن اس دے جی وچ میرا جی

جب سالک سلوک کی منزلیں طے کرتا ہوا فنا فی اللہ کی منزل رپہنچتا ہے اس وقت اس مشاہدے کی کیا صورت ہوتی ہے۔ اسے نوشہ صاحب یوں بیان کرتے ہیں۔

اوہو اوہ دسیوے باطن ظاہرا

اس بن ہور نہ کوئی اندر باہرا[3]

اوہو اپنا آپ نہ کوئی غیر ہے

دُبھتا اندر وَیر وحدت نت وَیر ہے

سبھنیں تھائیں توں ملیں دسیں ہر ہر روپ [4]

پر جس ڈٹھے ایہہ دسدا سو نوشہ روپ انوپ

وحدت میں سے کثرت اور کثرت میں سے وحدت کی گتھی سلجھاتے ہوئے

1- گنج شریف ص409

2- ایضاً ص445

3- ایضاً ص439

4- ایضاً ص225

خوبصورت مثال یوں پیش کرتے ہیں:

مٹی ہک پیاریا ہک بناون ہار
صورت آپو اپنی بھانڈے ہوئے تیار [1]
مٹی ہک پیاریا بھانڈے لکھ کروڑ
نوشہ اصل پچھان کے بھرم دلے دا توڑ

ایک اور خوبصورت مثال ملاحظہ کیجئے:

باطن ایک ظاہر انیک — ایک انیک پھر ایک ہی ایک [2]
کھنڈ ہک کھڈونے لکھ — نوشہ کھنڈ نظر وچ رکھ
صورت آپو اپنی ہوئے — کھنڈ کھڈاونے کہے سب کوئے
ظاہر بین ظاہر کوں ویکھن — باطن بین باطن توں بھیکھن [3]
باطن ظاہر ہک خدائے — نوشہ اس وچ شک نہ کائے

نوشہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ تمام کثرت دراصل وحدت میں سے ہے۔ اور آخر کار یہ کثرت وحدت میں ضم ہو جائیگی ۔ کیونکہ وحدت کے بغیر اور کچھ بھی نہیں ہے۔ کائنات کے مختلف مظاہر ہر روز اس فطری عمل کی حقیقت کو ہمارے سامنے لاتے ہیں تا کہ اس باریک نقطہ کا ادراک ہو سکے۔ چنانچہ حضرت نوشہ صاحبؒ ثقافتی اور گھریلو مثالوں سے اس نکتے کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں:

دیوے نال دل ہویا دیوا — کیف وحدت دے کیتا کھیوا [4]
جاتا ہک پچھاتا ہک — ڈِٹھا ہک تاں لگی سِک

1- گنج شریف ص455
2- ایضاً ص346
3- ایضاً
4- ایضاً ص450

ہکو باطن ہکو ظاہر ہکو اندر ہکو باہر
ہک ہک رل بوٹے ہوئے ہکو لکھے ہکو دھوئے
ہکسے بیجوں رکھ پیار ڈالی پتر پھُل پھَل ہزار
اوڑک اوہو بیج دا بیج
نوشہ آکھے سو ویکھ وتیج

خالق اور خلق بظاہر دو مختلف وجود ہیں۔ لیکن وحدۃ الوجودی صوفیاء کے نزدیک ظاہری وجود کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خلق، خالق اور خالقِ خلق کے بغیر نہیں ہے۔ صوفیاء کے اس عقیدے کی بنیاد کُنتُ کَنزًا مَخفیاً ہے۔ اسی عقیدے کے تحت بابا فرید الدین گنج شکرؒ فرماتے ہیں:

فریدا خالق خلق مانہہ خلق وسے رب مانہہ
مندا کس نوں آکھیئے جاں تس بن کوئی نانہہ [1]

نوشہ صاحبؒ نے اسی مضمون کو بھرپور انداز میں بیان کیا ہے۔ کیونکہ وہ خالق اور مخلوق کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھتے:

نوشہ ظاہر حق ہے باطن خالق ہے
کیا ظہورا خلق ہو خلق خالق نہیں دوئے [2]

نوشہ خالق ہک ہے دویا ناہیں کوئے
فرق خالق تے خلق وچ توں کہہ کیکر ہوئے [3]

پنجابی کے صوفی شعراء شروع سے ہی وحدۃ الوجود کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک خداوند تعالیٰ کے وجود کے علاوہ کسی اور وجود کو تسلیم کرنا شرک ہے اور مشرک کا

-1 آکھیا بابا فرید نے ص 220 (محمد آصف خاں کا خیال ہے کہ یہ اشلوک گرو ارجن کا ہے)
-2 گنج شریف ص 143
-3 ایضاً ص 456

ٹھکانہ دوزخ ہے۔ اور وحدت پرست کے لیے جنت کی بشارت ہے۔ اسی لیے نوشہ صاحبؒ اِیکتا کو بہشت اور دوئی کو دوزخ قرار دیتے ہیں۔

اِکتا بہشت پیاریا دوزخ بھرم دوئی
نوشہ آپ بھلائے کے دُبھتا خلق پئی[1]

نوشہ وحدت پائیاں پایا بہت آرام
غیر نہ کوئی جانیا ، جاتی وحدت عام[2]

جس من وحدت وسدی اوہ کافر کدے نہ ہوئے
نوشہ وحدت والیاں غیر نہ جاتا کوئے[3]

دبھتا دوزخ ساڑواں وحدت بہشت آرام
جیہناں مرشد پایا دوزخ تنہاں حرام[4]
وحدت دے وچ آئیکے نوشہ بہشت پئے
مرشد وہم گوایا وہم خیال گئے

فلسفہ وحدت الوجود سے متعلق حضرت نوشہ صاحبؒ کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ اس بات کا ثبوت ہمیں ان کے اشعار سے ملتا ہے:

جامی، سعدی، عربی، رومی دم وحدت وچ مارے
لا الـــــــہ الا ھـــو فرمایا نوشہ مرشد پیارے[5]

1- گنج شریف ص456
2- ایضاً ص455
3- ایضاً ص456
4- ایضاً ص457
5- ایضاً ص452

وحدت الوجودی صوفیاء وحدت الوجود کو وسیع سمندر اور سالک کو اس وسیع سمندر کا ایک قطرہ گردانتے ہیں۔ جو اپنی فنا کے بعد سمندر میں مل کر سمندر ہی بن جاتا ہے۔ مرزا غالب کا مصرعہ ہے:

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے

یا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

نوشہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

اوہو دیوے اوہو لوے

کل دریا سمندر وچ پوے (1)

جب ایک سالک فنا فی اللہ کی منزل سے گزر کر بقا باللہ کی منزل میں قدم رکھتا ہے تو اس وقت وہ وحدت کے رنگ میں وہی صورت اختیار کر لیتا ہے جس میں وہ سما جاتا ہے۔ اس وقت اس کی زبان بند ہو جاتی ہے اور اس کا دل خواہشات اور آرزؤں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اسکی زبان خالق کی منشاء کے بغیر ایک لفظ بھی ادا نہیں کرتی۔ گویا اسکی زبان، خدا کی زبان بن جاتی ہے۔ صوفیاء کا یہ عقیدہ اللہ تعالیٰ کے اُس فرمان کے مطابق ہے جو حدیث قدسی ہے۔ صحیح بخاری اور مشکوٰۃ شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

''جب میں کسی بندے سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ اسکی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے۔ اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ کا پکڑتا ہے۔ اس کے پیر بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔'' (2)

1- گنج شریف ص 468

2- فَـاِذَا اَحْبَبْتُـهُ فَكُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِی يَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرهُ الَّذِیْ يُبْصِرُبِهٖ وَيَدُهُ الَّتِی يَبْطِشُ بِهَا وَ رِجْلَهُ الَّتِیَ يَمْشِی بِهَا (بخاری ومشکوٰۃ)

چنانچہ جو واصل حق ہو جاتا ہے وہ حق ہی حق بن جاتا ہے۔ جس طرح لوہا آگ میں پگھل کر آگ ہی بن جاتا ہے۔ اس مقام پر اس کا ہر فعل اور ہر قول اللہ کا قول وفعل بن جاتا ہے۔ یہ کیفیت خالصتاً حال کی متقاضی ہے قال کی نہیں۔ کیونکہ ان بھیدوں کو صرف صاحب حال صوفیاء ہی سمجھ سکتے ہیں اس لیے کوئی دوسرا شخص قطعاً ادراک نہیں کر سکتا۔ اس حقیقت کے ادراک کے عکسوس صاحب حال صوفیاء کے کلام میں نظر آتے ہیں۔ حضرت نوشہ گنج بخشؒ نے تصوف کی جملہ منازل طے ہوئی تھیں، اس لیے انہوں نے اپنے کلام کے ذریعے وحدت الوجود کی معرفت کو نہایت دلچسپ انداز میں اپنے مریدین اور قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً

میں وحدت دا ساگر ٹھٹھکاں آپ وچ موجاں ماناں
آپے اچا نیواں تھیواں آپ نوں آپے تاناں[1]
آپے پسراں ، آپے سمٹاں سبھ میرا آنا جاناں
وحدت وچ نہ کثرت نوشہ میں ہر ہر وچ سماناں

فلسفہ وحدت الوجود کا اس قدر واضح اور بے باکانہ اظہار پنجابی شاعری میں سب سے پہلے نوشہ گنج بخش نے ہی کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

میرا انت کسے نہ پایا	ماپے کہن اساں ایہہ جایا[2]
کہن استاد ایہہ اساں پڑھایا	کہن کھڈاوے اساں کھڈایا
کہن مربی اساں سکھایا	نہ میں آیا نہ میں جایا
آپے آپنا روپ وٹایا	اوتھوں ایتھے کھیڈن آیا
میں سوامی سبھ میری مایا	آپے بھار ہے اپنا چایا
آپے بھاری پکڑ چوایا	آپے کیہا آپ سنایا

1- گنج شریف ص454
2- ایضاً ص452

ان ہویا ، ہویا سمجھایا　　آپے اپنے بھرم بھلایا
جو دیسے سو ایویں چھایا　　غمی خوشی ہک رنگ اٹھایا
جمن مرن ساگر لہرایا　　جتھوں اٹھیا پھیر سمایا
آپے ستا آپ جگایا　　سفنا ڈٹھا جو پر گھٹایا
آپے ڈٹھا آپ وکھایا
نوشہ آپ نوں آپ بھرمایا

نوشہ صاحبؒ کے اس واضح اظہار کے انداز نے بعد میں آنے والے صوفی شعراء کو بے حد متاثر کیا اور انہوں نے ان کی تقلید کو قابل فخر جانا۔ چنانچہ سید بلھے شاہؒ نے اس بیبا کانہ انداز کو اپناتے ہوئے اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا ہے:

نہ میں آدم ہوا جایا　　نہ میں اپنا نام دھرایا
اول آخر آپ نوں جانا　　نہ کوئی دوجا ہور پچھانا(1)
میتھوں ودھ نہ کوئی سیانا　　بلھا ! اوہ کھڑا ہے کون
بھلیا کیہ جاناں میں کون

o

اربع عناصر محل بنایو وچ وڑ بیٹھا آپے
آپے کڑیاں آپے نینگر آپے بنیا ایں ماپے
آپے مریں تے آپے جیویں آپے کریں سیاپے
بلھیا جو قدرت رب دی آپے آپ سنجھاپے

مسلمان صوفیائے کرام کا فلسفہ وحدت الوجود بیان کرنے کا انداز اس قدر دلچسپ اور مؤثر تھا کہ ہندو ویدانتی یوگی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہاں تک کے ویدانتی سوامی تیرتھ رام بھی مسلم خیالات ونظریات سے بے حد متاثر ہوا۔

-1　کلام بلھے شاہؒ: مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد۔ پیکجز لاہور، 1978 ص 18

چنانچہ اس کے کلام میں ہندومت کی بجائے مسلم عقائد جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔

جام شراب وحدت والا   پی پی ہر دم متوالا [1]
پی میں واری لاکے ڈیک   اللہ شہ رگ تھیں نزدیک
سُن لے سُن لے رام دہائی   بے انتا کیوں انت نہ پائی
ذات پات نوں لا نہ ڈیک   اللہ شہ رگ تھیں نزدیک

توبہ

بقول حضرت داتا گنج بخشؒ ''اچھی طرح سمجھ لو کہ راہروان طریقہ حق کا پہلا قدم توبہ ہے۔''[2]

قرآن حکیم میں ایمان والوں کو توبہ کا حکم دیا گیا ہے:

وَتُوبُو اَلی اللّٰہِ جَمِیْعاً اَیُّہَ الْمُومِنُوْنَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ

(ترجمہ: اے ایمان والو! تم سب اللہ کے حضور توبہ کرو، تا کہ تم فلاح پا جاؤ)

قرآن پاک کا یہ فرمان بھی دیکھیئے:

''اِن اللّٰہ یُحِبّ التَّوابِین ویُحِبُ الْمُتطھرِین''

(یعنی ۔ بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور پاک رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔)

قرآن پاک کے علاوہ احادیث میں بھی توبہ سے متعلق حضور اکرم ﷺ کے فرامین موجود ہیں۔

مشکوٰۃ شریف میں حدیث نبویؐ ہے: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے

2- علی عباس جلالپوری: وحدت الوجود تے پنجابی شاعری؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ لاہور 1977ء ص182

3- کشف المحجوب، اردو ترجمہ ص147

ہیں کہ حضورﷺ نے فرمایا۔ التائب من الذنب مکن لا ذنبہ لہٗ۔ یعنی توبہ کرنے والا اس شخص جیسا ہو جاتا ہے جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے توبہ کے تین درجے بیان کئے ہیں:

''توبہ کی پہلی شرط یہ ہے کہ مخالف حکم عمل پر افسوس کرے۔ دوسرے ترک کرتے ہوئے منفعل ہو۔ تیسرے عہد کرے کہ پھر ایسا نہ کرے گا۔''(1)

مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے ان تمام افعال پر افسوس کرے جو اس نے خدا اور رسولؐ کے احکام کے خلاف کئے ہوں۔ دوسرے ان افعال کو ترک کردے اور تیسرے ان سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لے اور پھر ان گناہوں کی طرف رجوع نہ کرے، جن کے متعلق اس نے توبہ کی ہے۔ بقول حضرت ابو بکر واسطیؒ:

''خالص توبہ کا یہ مطلب ہے کہ انسان کے ظاہر اور باطن میں گناہ کا ذرا بھی اثر نہ رہے۔''(2)

حضرت علی کرم اللہ وجہ کی روایت موجب حضورﷺ کا فرمان ہے:

''جو شخص گناہ کرے اور پھر اٹھ کر وضو کرے۔ دو رکعت نفل ادا کرے اور وہیں اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کرے۔ پس بموجب وعدۂ خداوندی اس پر بخشش و مغفرت واجب ہے کہ اس کو بخش دے گا۔''(3)

انسان کو جس طرح زندگی پر اعتبار نہیں اسی طرح موت پر اختیار نہیں۔ اس لیے اپنے گناہوں پر توبہ کرنے کے لیے ذرا بھی تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے۔ حضرت

1- کشف المحجوب ص147

2- غنیۃ الطالبین اردو ترجمہ عبدالعزیز چشتی لاہور 1976ء ص 203

3- ایضاً ص214

ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ حضورﷺ نے فرمایا:

''جوشخص توبہ کرنے میں تاخیر کرتا ہے۔ سمجھو وہ ہلاک ہوگیا۔''(1)

توبہ کا عمل ایک طرف انسان کی انفرادی زندگی میں انقلاب پیدا کردیتا ہےتو دوسری جانب اسکی انفرادی زندگی کی تبدیلی معاشرتی زندگی میں انقلاب برپا کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ کیونکہ انسان گناہ کا مرتکب ہوتے وقت اکثر حقوق العباد سے غافل ہو جاتا ہے۔ لیکن جب وہ سچے دل سے توبہ کر لیتا ہےتو پھر وہ حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کا بھی خیال رکھتا ہے۔ یوں اسکی زندگی دینی اور دنیاوی اعتبار سے سنور جاتی ہے۔

دیگر صوفیائے کرام کی مانند حضرت نوشہ گنج بخشؒ نے اس اہم پہلو کی طرف بھر پور توجہ دی ہے۔ ان کے خیال کے مطابق جب انسان توبہ کرکے گناہوں سے بالکل پاک ہو جاتا ہےتو یہ اسکے حق میں بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ باالفاظ دیگر یوں کہا جاسکتا ہے کہ انسان کے تمام سابقہ گناہ معاف ہو جانے کے بعد نیکیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بظاہر یہ ناممکنات میں نظر آتا ہے۔ لیکن جب گناہ ضائع ہو جاتے ہیں تو نامہ اعمال کو پاک صاف کر دیا جاتا ہے۔ یہی نیکی ہے۔ نوشہ صاحبؒ مومن کے لیے اس ربی عطا کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

توبہ کرے گناہوں جاں بندہ جھوٹھی کرے نہ بازی

پچھلیاں بدیاں نیکیاں کر لکھن ویکھ غریب نوازی (2)

توبہ کا مطلب برے افعال سے زبانی رک جانا نہیں بلکہ برائی سے عملی طور پر باز رہنا اور نیکی پر قائم رہنا ہے۔ اگر کوئی شخص زبانی توبہ کرے اور عملی طور پر گناہوں میں ملوث رہے یا عبادت و ریاضت میں مصروف رہے، مگر حقوق العباد اور حقوق اللہ کا

4- غنیۃ الطالبین اردو ترجمہ ص 211

5- گنج شریف ص 381

خیال نہ رکھے تو پھر اسکی توبہ اور عبادت بیکار اور بے فائدہ ہے:

کجھ نہ ہووے رکھیاں روزے سے ہزار
لقمہ چھڈ حرام دا نوشہ کہے پکار (1)

نوشہ صاحبؒ کے نزدیک انسان کی توبہ اس وقت قبول ہوتی ہے جب وہ رزق حلال کھائے۔ زبان سے جھوٹ نہ بولے۔ دل و جان سے حضور اکرم ﷺ کو اپنا راہبر اور راہنما تسلیم کرے اور اسوہ حسنہ کو اپنی عملی زندگی کا نمونہ بنائے۔

کھائیے حق حلال سچ کہیے جھوٹھ چھڈ یئے حرام نہ چا کھیئے (2)
سچے مرشد پاک محمدؐ اتے ہو تن صدقے پت را کھیئے

توبہ کے روحانی اور مذہبی پہلو کے ساتھ ساتھ معاشرتی پہلو یہ ہیں۔

بریائی کوئی کرے بُرا اسدا ناؤں
نوشہ آکھے بھلیا بُری بُرے دی تھاؤں (3)

مِٹھا بولن ہار ہے نوشہ سب دا یار
مندا بولن جگت وچ سبھسے کرے بیزار (4)

دنیا کی بے ثباتی

انسان اپنی پیدائش سے لے کر آج تک جس خوف و وہم سے پیچھا نہیں چھڑا سکا وہ موت ہے۔ اس خوف کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قدرت کی طرف سے بلاشبہ موت کا

1- گنج شریف ص382
2- ایضاً ص383
3- ایضاً ص378
4- ایضاً ص382

وقت معین ہے۔لیکن انسان اس معینہ وقت سے بے خبر ہے۔انسان کی یہ بے خبری اس کے سر پر ہر وقت خوف کی تلوار لٹکائے رکھتی ہے۔مختلف ادیان کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ جملہ مذاہب کے پیغامات کی بنیاد موت کے تصور پر قائم ہے۔اسی لیے ہر مذہب انسان کو زندگی میں نیک اعمال کرنے کی تلقین کرتا ہے۔تا کہ موت کے بعد جزا اور سزا کے سلسلے میں جزاء کا مستحق قرار پائے۔اگرچہ ہر مذہب کی تعلیم ایک دوسرے سے مختلف ہے۔لیکن ہر صوفی نے موت کو برحق تسلیم کیا ہے۔جس سے کسی ذی روح کو مفر نہیں۔اس لیے صوفیائے کرام نے ہدایت کی ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر موت کو ہمیشہ یاد رکھو۔ دنیا میں عظیم لوگوں کے مزارات ، یادگاریں اور مقابر مقامِ عبرت ہیں۔ جو موت کی صداقت کے نشان ہیں اور بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے موت اور موت کے بعد زندگی کے لیے کچھ کر لینے کے پیغام کی علامات ہیں۔تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں مختلف مذاہب کے پیروکاروں نے موت کی حقیقت کو قبول کرنے کے مختلف طریقے اپنائے۔ جیسے گوتم بدھ،شوپنہار اور ہارٹ مان نے کہا کہ یہ دنیا '' دار المحن '' ہے یعنی دکھوں کا گھر ہے اور موت کے بغیر ان دکھوں سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ ان کے خیال کے مطابق انسان کو دکھوں میں مبتلا کرنے والے اس کے اپنے اہل و عیال ہیں۔اس لیے انسان کو شادی کے بندھ میں نہیں بندھنا چاہیئے ۔ یوں نہ اس کے اولاد ہوگی اور نہ ہی وہ دنیاوی جھمیلوں میں گرفتار ہوگا۔اس کے مقابلے میں ہندو یوگیوں نے موت کو یاد رکھنے کا یہ طریقہ اپنایا ہے کہ وہ مردے کی کھوپڑی میں بھکشا لیتے تھے۔تا کہ اپنے انجام سے باخبر رہیں۔اسی طرح زمانہ قدیم میں ایران میں لوگ کھانے پینے کے لیے کھوپڑی استعمال کرتے تھے۔ جیسے عمر خیام کا یہ مصرع زبان زد عام ہے:

ے وز کلۂ اُو جامِ شراب است مرا

لیکن اسلام نے دنیاوی لالچ اور دنیاداری سے نفرت کرنے اور عاقبت سنوارنے کے لیے جو نیک اعمال کرنے کا درس دیا ہے وہ سب ہی مذاہب سے جداگانہ

اورمنفرد ہے۔ اس درس میں موت کا خوف نہیں ہے بلکہ موت کو ایک اٹل حقیقت سمجھ کر اسے قبول کرنے ، اس کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنے اور موت کی جگہ اپنے خالق حقیقی سے محبت کرنے اور صرف اسی سے ڈرنے کا تصور دیا گیا ہے۔ ہمارے صوفیائے کرام نے قدم قدم پر جہاں موت کو یاد رکھنے کی تلقین کی ہے وہاں انسان کو مقام انسانیت سے گرنے کی کہیں بھی نصیحت نہیں کی۔ چنانچہ مسلم صوفیاء نے نہ صرف زندہ انسانوں کی توقیر میں اضافہ کیا بلکہ مرنے کے بعد بھی ان کے احترام کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی مسلمان صوفی نے موت کو یاد رکھنے کے بہانے ہندو یوگیوں کی طرح کبھی بھی انسانی کھوپڑی میں نہ تو بھیک مانگی اور نہ ہی اس میں کبھی کھانا کھایا۔ بلکہ مسلمان صوفیاء نے انسان کی توہین تو ایک طرف اپنی دھرتی کی مٹی کو برا کہنے سے بھی منع کر دیا اور بتایا کہ اس مٹی سے ہمارا خمیر تیار ہوا ہے۔ جب ہم زندہ ہوتے ہیں تو زمین کا فرش ہمارے قدموں میں بچھتا چلا جاتا ہے اور زمین ہمارے قدم لیتی ہے۔ لیکن جب مرجاتے ہیں تو یہی مٹی ہماری اُس حالت کو اپنی آغوش میں چھپا لیتی ہے جسے انسانی آنکھ دیکھتے ہوئے بھی خوف کھائے۔ اسی صورتحال کے حوالے سے یہاں مثال کے لیے بابا فریدؒ کے صرف دو شلوک پیش کیے جاتے ہیں:

جند ووہٹی مرن ور لے جاسی پرناءِ
اپن ہتھیں جول کے کیں گل لگے ڈھاءِ[1]

فریدا خاک نہ نندیئے خاکو جیڈ نہ کوءِ
جیوندیاں پیراں تلے مویاں اُپر ہوءِ[2]

پنجابی صوفی شعراء نے دنیا سے اس انداز سے بے اعتنائی برتنے کا پیغام نہیں

1- آکھیا بابا فرید نے ص 142
2- ایضاً ص 160

دیا کہ انسان دنیا میں آنے کا مطلب ہی نہ سمجھ سکے۔ کیونکہ وہ دنیا سے کنارہ کشی کو جائز نہیں سمجھتے۔ بلکہ دنیا میں رہ کر دنیا سے کنارہ کش ہونے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ وہ صرف جائز خواہشات کی تکمیل ضروری سمجھتے ہیں اور فطری ضرورت سے زیادہ دنیاوی دولت اور جائیداد سے متنفر ہیں۔ مثلاً

فریدا کوٹھے منڈپ ماڑیاں اسار دے گئے
کوڑا سودا کر گئے گوریں آءِ پئے (1)

دنیا کی بے ثباتی کے متعلق بابا فریدؒ فرماتے ہیں:

کندھی اُتے رُکھڑا کچرک بنھے دھیر
فریدا کچے بھانڈے رکھیئے کچرک تائیں نیر (2)

ویکھ فریدا جو تھیا داڑھی ہوئی بھور
اگوں نیڑا آیا پچھا رہیا دور (3)

بڈھا ہویوں شیخ فریدا کنبن لگی دیہہ
جے سو ورھیاں جیوناں بھی تن ہوسی کھیہہ (4)

شاہ حسینؒ آکھدے نیں:

سر تے موت کھڑی پکارے من لو چے باغ بہاراں نوں (5)
کہے حسین فقیر نمانا کوئی مڑ سمجھاؤ ایہناں یاراں نوں

1- آکھیا بابا فرید نے ص 189
2- ایضاً ص 241
3- ایضاً ص 152
4- ایضاً ص 184
5- کافیاں شاہ حسین ص 62

کوئی دم جیوندیاں روشنائی مویاں دی خبر نہ کائی
چونہہ جنیاں رل ڈولی چائی ساہورڑے پہنچائی
سس ننا ناں دیندیاں طعنے داج وہونی آئی
قبر نمانی وچ گئیاں بنھ چلایا ڈاڈھے دیاں وہیاں
رہیاں ہول ہوائیں
کہے حسین فقیر نمانا ، دنیا چھوڑ ضروری جانا
رب ڈاہڈے قلم چلائی (1)

دنیا کی بے ثباتی ، پنجابی شاعری کی بھر پور روایت رہی ہے۔حضرت نوشہ گنج بخشؒ نے اس روایت کو اور زیادہ پختہ بنیاد فراہم کی ہے۔ان کا انداز اس قدر دلچسپ، اچھوتا اورمنفرد ہے کہ پڑھنے والا ان کا ہم خیال بن جاتا ہے۔ ان کے بیان کئے ہوئے حقائق کا معترف ہو جاتا ہے اور ان کی صداقتوں پر ایمان لے آتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کے متعلق حضرت نوشہ صاحبؒ بیان کرتے ہیں:

مرسی جو کوئی جمیا مرنوں مول نہ لُک
نوشہ ویلا موت دا ذرا نہ پوسی چُک (2)
انت اوڑک مر جاوناں دم دا نہیں وساہ
نوشہ مریئے کیوں نہ مرشد سندے راہ
دنیا جاندی ویکھ کے کیوں کریئے ارمان
نہ کوئی رہیا نہ رہے گا نوشہ ایس جہان (3)
اگے پچھے مرنا رہناں ناہیں اِتھ
جاں اوہ ویلا پہنچسی پلک نہ پوسی وِتھ

1- کافیاں شاہ حسین ص 85
2- گنج شریف ص 561
3- ایضاً ص 562

نت نہیں ایتھے ہوونا چھڈ نا ہے جہان
ایہہ جگ ڈٹھا پیاریا دو دم دی گزران

نوشہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ موت سے قطعاً مفر نہیں۔ دنیا میں انسان بے شک پختہ انتظامات کر لے، سلطنت اور جائیداد بنا لے، دنیا جہان کے اطباء جمع کر لے پھر بھی وہ موت سے نہیں بچ سکتا۔ دنیا میں فرعون، قارون، ارسطو، بقراط، سقراط، افلاطون، جالینوس اور ابونصر جیسے حکیم، دانشور اور فلاسفر دنیا کی بے ثباتی یعنی موت کا کوئی تدارک نہ کر سکے۔ ان مشاہیر کی موت دراصل کھلم کھلا اعلان ہے کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے اور ''کُل نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت'' ایسا فرمان ہے جسکی تنسیخ ناممکن ہے۔

نوشہ صاحبؒ نے اپنے کلام میں اس موضوع پر بھی بہت کچھ بیان کیا ہے۔ یہاں طوالت سے اجتناب برتتے ہوئے نوشہ صاحبؒ کے چند اشعار پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ان کے یہ اشعار جہاں دنیا کی بے ثباتی کو بیان کرتے ہیں وہاں تلمیحات کی خوبصورت مثالیں بھی ہمارے سامنے لاتے ہیں:

امر وی نہ منیا قارون تخت نگھاریا
ڈوبیا فرعون نوں نمرود پولیں ماریا[1]

دِق نال ارسطو مویا گئی نہ حکمت پیش
آوندا روگ پچھاتوس ناہیں نوشہ کہے درویش[2]
وڈا حکیم بقراط سیانا ، مویا اوکھا ہوئے
کھنگھدے کھنگھدے پھپھر پاٹا اوکھد چلی نہ کوئے

1- گنج شریف، ص527
2- ایضاً ص558

جالینوس جیہا وید نہ کوئی پیٹ چلیندے مویا
ویہندا پانی اوکھد بدھاّ پیٹ دا کجھ نہ ہویا
افلاطون وُنہتروں وڈا مار لیا ادھر نگے
پیش نہ گئی سیانپ کائی پھاتا موت دے ڈنگے
ابو نصر سودائی ہویا حکمت چلی نہ کائی
نوشہ کہے فقیر قادر دا موت نے عقل گوائی

نوشہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی موت کے بعد اسکے عزیز و اقارب یوں روتے ہیں جیسے اس نے کبھی واپس نہیں آنا۔ واقعی حقیقت ہے کہ مرنے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے مگر رونے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے بھی ایک دن مرنا ضرور ہے۔ پھر رونے سے مرنے والے زندہ نہیں ہو جاتے۔ اسلیے کسی کی موت پر رونے سے بہتر ہے کہ صبر، ہمت اور برداشت سے کام لیا جائے اور آخرت کی فکر کی جائے:

مویاں نوں سبھ رووندے روندے بھی مرجان
جگت جنجالیں رُجھیا چُھٹے جیہناں پچھان (1)
نہ کوئی مویا نہ مرے غافل مرے اجان
نوشہ تجھے رووناں موڑے ناہیں آن

نوشہ صاحبؒ دنیا کی بے ثباتی بتاتے ہوئے آخرت کی فکر کا درس یوں دیتے ہیں:

جیون مرن حکم پچھان
چلن سرا ایہہ دنیا جان (2)
نہ کر خودی وڈیائیاں دنیادار کہائے
آوندا کفنی پایو جاسیں کفی پائے

1- گنج شریف ص560
2- ایضاً ص552

نہ کر مان تکبری وڈا نہ سردائے
مُٹھی میٹیں آیوں مُٹھی میٹیں جائے

اس سلسلے میں حدیث نبویؐ ہے کہ ''الدُنّیا جِیفَۃٌ وَطَالِبھَا کِلَابَ ''یعنی دنیا ایک مردار ہے اور اس کے چاہنے والے کتے ہیں۔ حضرت نوشہ صاحبؒ نے اس حدیث کی روشنی میں دنیاوی آلائشوں سے علیحدہ رہنے کا درس دیا ہے:

دنی دار جیوں کُتے کاؤں لبھن گند مردار دی تھاؤں[1]
کاں اکٹھے ہوکے کھاون کاں کاں کر ہم جنس بلاون
ہک دوئے نوں بھونکن کُتے لڑن گند مرداراں اُتے
ونڈ کھاون سو کاں کہاون لڑن جو کُتے ناں دھراون
اوہ بھلیائی اوہ بریائی دنیا داراں دی کیہ وڈیائی
نیکاں لعنت بداں کیا کہیئے دنیا داراں توں پاسے رہیئے

نوشہ کہے پکار پکار
بھٹھ دنیا بھٹھ دنیا دار

اخلاقی شاعری

انسانی سماج کا اہم ستون اخلاق ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انسانی سماج کی بنیاد ہی اخلاق پر قائم ہے۔ اگر ہم کسی بھی مذہب کا مطالعہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ مذہب انسانی اخلاق کو سنوارتا ہے۔ اسے ایسے اخلاقی ضابطے فراہم کرتا ہے جن پر عمل پیرا ہوکر انسان دنیا اور آخرت کی کامیابیوں سے ہمکنار ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جس قدر انبیاء کرام مبعوث فرمائے سب نے ہی اخلاق سنوارنے کا درس و پیغام دیا ہے۔

-1 گنج شریف ص 90